اپریل۔جون ۲۰۱۶ء

ISSN: 2321-8339

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

دعوت دین کے اصول وآداب
سید بلال الدین عمری

صوفیانہ تفسیری رجحان کا ارتقاء
حافظ محمد احسن رضا

اسلامی ریاست میں ادارۂ احتساب
مولانا محمد جرجیس کریمی

امیر خسرو کی تصنیف 'خزائن الفتوح'
ڈاکٹر محمد امین عامر

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ۔اسلام کا نقطۂ نظر
مولانا محمد قمر الزماں ندوی

معاشی فلاح وبہبود کا اسلامی تصور
ڈاکٹر سعدیہ گلزار

شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کی تفسیر
پروفیسر توقیر عالم فلاحی

تعارف وتبصرہ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل _____ جون ۲۰۱۶ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۵ شمارہ: ۲

رجب ——— رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ

اپریل ——— جون ۲۰۱۶ء

- مجلہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر لوڈ کر دیے گئے ہیں
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات صرف tahqeeqat@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

فون: 0571-2902034 موبائل: 08126677681

ای میل : idaratahqeeq2016@gmail.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۴۰ روپے
سالانہ	۱۵۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۶۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۲۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۲۵ امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۰ امریکی ڈالر

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

دعوت دین کے اصول وآداب — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

صوفیانہ تفسیری رجحان کا ارتقائ — حافظ محمد احسن رضا — ۱۵

اسلامی ریاست میں ادارۂ احتساب — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۲۵

امیر خسرو کی تصنیف 'خزائن الفتوح' — ڈاکٹر محمد امین عامر — ۴۱

بحث ونظر

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ۔ اسلام کا نقطۂ نظر — مولانا محمد قمر الزماں ندوی — ۴۹

معاشی فلاح وبہبود کا اسلامی تصور — ڈاکٹر سعدیہ گلزار — ۷۳

سیر وسوانح

شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کی تفسیر — پروفیسر توقیر عالم فلاحی — ۸۹

تعارف وتبصرہ

محمد ﷺ۔ عصر حاضر کے پیغمبر — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۳

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار — ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی — ۱۱۰

زندگی کا خزانہ — ڈاکٹر عبد الرحمن فلاحی — ۱۱۶

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۵۹) — ۱۱۹

مضامین کا انگریزی خلاصہ — ۱۲۱—۱۲۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ حافظ محمد احسن رضا
ریسرچ اسکالر، شعبۂ علوم اسلامیہ، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد (پاکستان)
ahsan.raza62@yahoo.com

۲۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ
jarjees.karimi@gmail.com

۳۔ ڈاکٹر محمد امین عامر
۱۰۱۔ پیل خانہ، سیکنڈ لین، ہاوڑہ۔ (۷۱۱۱۰۱) مغربی بنگال

۴۔ مولانا محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری، مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducalionalsociely@gmail.com

۵۔ ڈاکٹر سعدیہ گلزار
لیکچرر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، لاہور کالج فار ویمن یونی ورسٹی، لاہور
sadiagulzar-icwu@gmail.com

۶۔ پروفیسر توقیر عالم فلاحی
شعبۂ دینیات (سنی)، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
towqeer@yahoo.com

۷۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی
mrnadvi@yahoo.com

۸۔ ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
مدیر ماہ نامہ ندائے اعتدال، مدرسۃ العلوم الاسلامیۃ، جمال پور، علی گڑھ
tariqnadwialig@yahoo.com

۹۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

دعوتِ دین کے اصول وآداب

سید جلال الدین عمری

مرکز جماعت اسلامی ہند میں مرکزی شعبۂ دعوت کے زیر اہتمام سکریٹریز حلقہ جات برائے شعبۂ دعوت کا سہ روزہ ورک شاپ ۵ تا ۷/۶ ستمبر ۲۰۱۵ کو منعقد ہوا تھا۔ اس کے اختتامی سیشن میں مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی ہند نے زادِراہ کے طور پر جو خطاب کیا تھا، اسے افادۂ عام کے لیے، ان کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا جارہا ہے۔

(رضی الاسلام)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسوله الأمين وعلى آله وأصحابه اجمعين أمّابعد:

ذمہ دارانِ مرکز اور مختلف حلقوں کے ذمہ دار حضرات !میں آپ سب اصحاب کا مرکز جماعت میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس موقع پر دعوت کے سلسلے میں بعض باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ باتیں کسی مجلس میں اس سے پہلے بھی آئی ہوں، لیکن جو باتیں زیادہ اہمیت کی ہوتی ہیں، ان کی طرف بار بار توجہ دلانا اور یاد دہانی کرانا مفید ہوتا ہے۔

دعوت کا میدان وسیع ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا کام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی اہمیت ہمیں اسی طرح محسوس کرنی چاہیے جیسے قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے، جو اس امت پر ڈالی گئی

ہے۔ امت کا جو طبقہ بھی یہ کام کر رہا ہے وہ قابل قدر ہے۔ ہم ان کی مخالفت نہیں کرتے، بلکہ ان کی تائید ہی کرتے ہیں۔

کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ہندستان میں جو مختلف طبقات ہیں ان میں کن کن میں قبولِ حق کی صلاحیت ہے۔ دعوتی مقصد سے یہ ایک اچھی بات ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ہمارا خطاب پورے ملک بلکہ پوری دنیا سے ہے۔ ایسی صورت میں یہ رویہ نہیں اختیار کیا جاسکتا جس سے یہ تاثر قائم ہو کہ جماعت فلاں طبقہ یا فلاں علاقہ ہی کے لوگوں کے درمیان دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دے رہی ہے۔ اسلام کا مزاج تو ساری دنیا میں پھیلنے کا ہے۔ آپ کا تجربہ بتا رہا ہوگا کہ نچلے طبقات کے لوگوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا ہے اور اونچے طبقات کے لوگوں نے بھی۔ اونچے طبقے کے افراد اسلام ساتھ دیتے ہیں تو اس کے اثرات زیادہ محسوس کیے جاتے ہیں اور وہ سماج کو زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم جس فرد یا گروہ تک بھی پہنچ سکتے ہیں، پہنچنے کی کوشش کریں اور اسلام کی تعلیم کو حکمت و تدبر کے ساتھ پیش کریں۔ اب یہ ہر ایک کا اختیار ہے کہ دین کے بارے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہے، کرے۔

دعوت کا میدان بڑا وسیع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہا گیا کہ آپ اعلان کر دیجیے: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔ (الاعراف :۱۵۸) ”اے لوگو! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں“۔ امت مسلمہ کے بارے میں کہا گیا: لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (البقرة: ۱۴۳) ”تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔“ اس اعلان ہی میں یہ بات شامل ہے کہ لوگ اسے قبول بھی کریں گے اور نہیں بھی کریں گے، لیکن مجموعی طور پر ہمارا رویہ ایسا ہونا چاہیے جس سے معلوم ہو کہ اللہ کا دین تمام لوگوں کے لیے ہے۔ ہر فرد بشر اس کا مخاطب ہے۔ اللہ کا دین اگر کوئی ایک شخص بھی قبول کر لے تو بعض اوقات سماج کے اندر اس کے ذریعہ بڑی تبدیلی آ سکتی ہے، عدل و انصاف قائم ہوسکتا اور ظلم ختم ہوسکتا ہے، حق دار کو اس کا حق مل سکتا ہے۔

اسلام کا ایک مقصد عدل وقسط کا قیام بھی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا تھا، اس میں بہت وضاحت کے ساتھ انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ ''تم میں سے جو کم زور ہے، وہ میرے نزدیک طاقت ور ہوگا، جب تک کہ میں اس کا حق نہ دلادوں۔ اسی طرح تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک کم زور ہوگا، جب تک کہ میں اس سے دوسرے کا حق نہ لے لوں۔''

دعوت کی جامعیت

اللہ تعالی کو ایک ماننا، ایک حقیقت ہے۔ اس کا تعلق انسان کی ذاتی زندگی سے بھی ہے اور اجتماعی زندگی سے بھی۔ اس کا تعلق سیرت واخلاق سے بھی ہے اور معاملات سے بھی۔ جو اس کو نہیں مانے گا، وہ ایسے ہی نقصان میں رہے گا جیسے بجلی کے کھلے تار پڑے ہوں، بارش کا موسم ہو اور کوئی شخص بتا رہا ہو کہ آگے بڑھو گے تو کرنٹ لگ جائے گا۔ اب جو مانے گا وہ بچ جائے گا اور جو نہیں مانے گا وہ تباہ ہو جائے گا، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، اونچی ذات کا ہو یا نچلی ذات کا۔ اس لیے کہ کسی واقعہ کے بعد اس کے ممکنہ نتائج سے نہیں بچا سکتا۔ اس لیے جس شخص سے بھی آپ بات کریں، اسے بتائیں کہ اللہ کے دین کو اختیار کرنے ہی میں تمہاری دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔ دنیا کی فلاح کا مطلب یہ ہے کہ اسے اختیار کرنے سے آدمی صاف ستھری زندگی گزارے گا، جھوٹ کی جگہ سچ بولے گا، امانت و دیانت داری اختیار کرے گا اور اس کی وجہ سے اسے کوئی نقصان بھی ہوگا تو اس کا اجر اسے آخرت میں ملے گا۔

دعوتِ دین پیش کرتے وقت ہمیں توحید کے ساتھ عقیدۂ آخرت پر بطور خاص زور دینے کی ضرورت ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مان رہے تھے یا اس کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے تھے، ان کے سامنے قرآن مجید نے دلائل سے ثابت کیا کہ آخرت آئے گی، انسان نے اس دنیا میں جو کچھ کیا اس کا حساب ہوگا

اور نیک و بد کا فیصلہ ہوگا، نیکو کار جنت کے مستحق ہوں گے اور بدکردار انسانوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں، انسان کو ڈرانے کے لیے یہ سب عقیدے گھڑ لیے گئے ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حالاں کہ اگر خدا ہے تو آخرت بھی ہے۔ آدمی خدا کو مانے اور آخرت کو نہ مانے، یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص خدا اور آخرت دونوں کا انکار کرسکتا ہے، لیکن خدا کو ماننے والا آخرت کا انکار نہیں کرسکتا۔

دنیا سے تعلق

اللہ تعالیٰ کی ذات اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ انسان کے سامنے یہ سوال رہا ہے کہ وہ اس سے کس طرح قریب ہو، بلکہ اس کی ذات میں گم ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ اس مادی دنیا سے تعلق ختم کیا جائے اور روحانی زندگی گزاری جائے۔ اس مقصد سے لوگوں نے جنگلوں اور غاروں میں زندگی بسر کی اور بڑی سخت تکلیفیں برداشت کیں۔ موجودہ دور میں مادیت کا غلبہ ہے۔ اس کے ردعمل میں بھی دنیا سے نفرت اور دوری کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔

اسلام اس تصور کے خلاف ہے، اس نے کہا ہے کہ اللہ کو پانے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے ترکِ دنیا کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس سے دنیا اچھے اور نیک لوگوں سے خالی ہو جائے گی اور برے لوگوں کا غلبہ ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کی راہ یہ ہے کہ آدمی اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، اپنی ذات کے، اپنے گھر اور خاندان کے اور معاشرے کے حقوق ادا کرے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے پیغمبر آئے، سب نے اسی کی تعلیم دی۔ یہی اللہ سے قربت کا ذریعہ ہے۔

موجودہ دور اس کا تقاضا کرتا ہے کہ اسلام کی اس فطری تعلیم کو عام کیا جائے۔

ملک کا طبقاتی نظام اور اسلام

آپ جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یہاں طبقاتی نظام (Cast System) ہے۔مسلمان مختلف طبقات میں بٹے ہوئے ہیں، یہ ایک تکلیف دہ صورت حال ہے، لیکن مسلمانوں سے زیادہ یہاں کے غیر مسلم بھائی مختلف طبقات اور گروہوں میں منقسم ہیں۔ساری سیاست اسی پر چلتی ہے کہ ہماری برادری کے لوگ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں؟ اسی پر سارا زور صرف ہوتا ہے۔ملک کے اندر ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور ہے ،اس کی وجہ سے ملک کی ایک بہت بڑی آبادی کو مساوی حقوق (اگرچہ دستوری طور پر حاصل ہیں لیکن) سماجی طور پر حاصل نہیں ہیں۔اس کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی ۔کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل کاموں کی تقسیم تھی ، جسے بعد میں مذہبی رنگ دے دیا گیا، حالاں کہ کاموں کی تقسیم صلاحیت کے لحاظ سے ہونی چاہیے، نہ کہ ذات کی بنیاد پر۔کسی کا باپ اگر دھوبی ہے تو وہ بھی دھوبی ہوگا ،اگرچہ وہ کتنا ہی پڑھ لکھ لے ۔ ہندوستان کے طبقاتی نظام پر راقم نے ایک مضمون میں الگ سے بحث کی ہے ۔(ملاحظہ کیجیے: ملک وملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۷۔۴۱) اس طرح کی جو کم زوریاں ہیں وہ انسان کی عزت و وقار کے منافی ہیں، انہیں ختم ہونا چاہیے اور یہ تصور سامنے آنا چاہیے کہ سارے انسان برابر ہیں۔قرآن اور حدیث میں یہی بات بہت وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی ہے کہ انسانوں کے درمیان خاندانوں،قبیلوں اور قوموں کی تقسیم اللہ تعالی کے نزدیک محض تعارف کے لیے ہے۔سورۂ الروم میں کہا گیا ہے کہ انسانوں کے درمیان رنگ، زبان اور نسل کا جو بھی فرق پایا جاتا ہے وہ قدرت کی نشانیاں ہیں ۔اس کی وجہ سے انسانیت تقسیم نہیں ہوتی۔ (الروم:۲۲) سورۂ حجرات میں کہا گیا ہے کہ سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں (چاہے وہ ہندستان میں ہوں یا ہندستان سے باہر،ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں ، یورپ میں ہوں یا امریکہ میں، چاہے جہاں ہوں،سب انسان

ہیں اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔) ان کے درمیان اگر فرق ہوسکتا ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ ان میں سے کون شخص اللہ سے زیادہ ڈر کر زندگی گزارتا ہے۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

دین میں کوئی زبردستی نہیں

آپ اس ملک کے سامنے، بلکہ ساری دنیا کے سامنے یہ واضح کریں کہ اسلام میں زور زبردستی، جبر اور دباؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتارا نہیں جا سکتا، البتہ اس سے منافق پیدا ہو سکتے ہیں جو بہ ظاہر ایمان اور اسلام کا اقرار کریں اور اندر سے اس کی بیخ کنی کرتے رہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس طرح کے لوگ اس کے دامن میں آئیں گے تو اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچائیں گے اور کوئی شخص یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کی سوسائٹی میں ایسے لوگ آئیں جو اس کو نقصان پہنچائیں۔ قرآن میں بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ جب منافقین مسلمانوں کے معاشرے میں آجاتے ہیں تو کیا خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس نے بہت وضاحت کے ساتھ کہا ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (البقرۃ: ۲۵۶)

''دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔''

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ کوئی مخصوص دین اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ دین کے معاملے میں زور زبردستی نہیں کی جائے گی۔ اس کے اندر دونوں باتیں شامل ہیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ گم راہی اور ضلالت، ہدایت اور سیدھا راستہ کیا

ہے؟ یہ بات واضح ہوچکی ہے۔ ہمارا موقف تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص طاغوت اور خدا کی مخالف طاقتوں کا انکار کردے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو ایک مضبوط رسی اس کے ہاتھ آجائے گی اور وہ ایسی رسی ہوگی جو اللہ تک پہنچانے والی ہوگی، جو کبھی ٹوٹے گی نہیں، لیکن اگر آدمی اس کا انکار کرتا ہے تو وہ اس دلیل اور اس رسی سے محروم ہوجائے گا جو اللہ تک پہنچاتی ہے۔

موجودہ حالات میں کہا جاتا ہے کہ مسلمان دہشت گردی اور لالچ کے ذریعہ اسلام قبول کرنے کے لیے لوگوں کو آمادہ کرتے ہیں۔ یہ الزامات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ جبراً اگر کوئی شخص اسلام قبول کرلے تو اسلامی قانون کے لحاظ سے وہ مسلمان نہیں ہوتا۔ فقہاء نے بہت تفصیل سے اور میں نے اپنی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' میں اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص یا فلاں گروہ نے میرے ساتھ زبردستی کی ہے اور مجھے میرے مذہب سے پھیر دیا ہے تو اسلامی عدالت اس سے کہے گی کہ تم اپنے مذہب میں واپس جاسکتے ہو، پھر وہ اس شخص کو سزا بھی دے گی جس نے اس کے ساتھ جبر کا معاملہ کیا ہے۔ یہ بات ہماری پالیسی میں تو مختصراً کہی گئی ہے، لیکن دستور میں وضاحت کے ساتھ آئی ہے کہ ہم دعوت وتبلیغ کے لیے جبر کا راستہ اختیار نہیں کریں گے، بلکہ اسلامی تعلیمات کو رائے عامہ ہموار کرکے دنیا کے سامنے رکھیں گے۔

اسلام ہی دین حق ہے

اسلام دین حق ہے۔ قرآن اپنے بارے میں کہتا ہے کہ وہ حق ہے، وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ (بنی اسرائیل: ۸۱) 'کہہ دو، حق آ گیا'۔ دوسری جگہ دین ہی کو حق کہا گیا ہے۔ حق کا مطلب ہے ثابت شدہ حقیقت۔ اسلام ثابت شدہ حقیقت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اسے حق کہا جاتا ہے۔ یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ آنی چاہیے اور موجودہ حالات میں اس کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بعض مواقع پر آر ایس ایس اور اس کے ہم خیال لوگ کہتے ہیں کہ آپ یہ نہ کہئے کہ ہم ہی حق پر ہیں۔ اگر آپ یہ نہ کہیں تو ہمارا اختلاف ختم ہوجائے گا۔ ہم کہیں گے

کہ آپ بھی حق پر ہیں اور ہم بھی حق پر ہیں۔لیکن یہ ایک بے اصل بات ہے۔ اگر کوئی شخص مجھ سے سوال کرے کہ ہندوستان میں دنیا کے بیش تر مذاہب موجود ہیں۔ یہاں ہندومت ہے، بدھ مت ہے، جین مت ہے، سکھ مت ہے، عیسائیت ہے اور یہودیت بھی پائی جاتی ہے۔ان تمام مذاہب میں سے آپ نے اسلام کو کیوں اختیار کیا؟ تو اس کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے اور ایک ہزار سال تک اس ملک میں مسلمان حکومت کرتے رہے، اس لیے میں بھی مسلمان ہوں۔لیکن آج کی دنیا میں یہ کوئی معقول اور مطمئن کرنے والا جواب نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ غیر عقلی جواب ہے۔اسی طرح یہ کہنا کہ سب مذاہب برحق ہیں، غیر منطقی بات ہے۔شرک اور توحید ایک ہوجائیں، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔البتہ یہ معقول بات ہوگی کہ میں نے اسلام کو برحق پایا، اس لیے میں نے اسے اختیار کیا ہے، اسی کو میں صحیح سمجھتا ہوں، علمی دنیا میں اسے چیلنج کرنا آسان نہیں ہے۔ میں اسلام کو حق سمجھتا ہوں لیکن اس کے ساتھ دوسرے مذاہب کے تعلق سے میں غلط جذبات کا اظہار نہیں کرتا اور برے الفاظ میں ان پر تنقید نہیں کرتا۔لیکن یہ غیر معقول بات ہے کہ آپ کہیں کہ دوسرا بھی حق پر ہے اور ہم بھی حق پر ہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس ملک میں بہت سے مذاہب کے ماننے والے لوگ ہیں تو سب کو مل کر رہنا ہوگا۔ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور کوئی ایسا رویہ نہیں اختیار کرتے جس سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان عداوت اور دشمنی پیدا ہو۔ جہاں کہیں موقع ہو، اس بات کی وضاحت ہماری طرف سے ضرور ہونی چاہیے کہ اسلام کو ہی ہم حق سمجھتے ہیں، لیکن اس کے لیے زور زبردستی کا راستہ اختیار نہیں کرتے۔ اس لیے نہیں کہ یہ ہماری پالیسی ہے، بلکہ اس لیے کہ جس قرآن پر ہمارا ایمان ہے اس کی بنیادی تعلیم ہی زور زبردستی کے خلاف ہے۔ قرآن نے صاف صاف کہا ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً۔ (الدھر: ۳)

''ہم نے انسان کو راستہ بتادیا ہے، چاہے تو وہ شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے اور چاہے تو ناشکری کا راستہ اختیار کرے۔''

اسلام اور تکریم انسانیت

غیر مسلموں کے سامنے ہمیں تکریمِ انسانیت کا پہلو بھی ابھارنا چاہیے، جس سے یہ معلوم ہو کہ کوئی انسان ذلیل اور پست نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اخلاق کے پہلو کے لحاظ سے پست ہے تو سمجھ میں بات آتی ہے، لیکن یہ تصور کرنا کہ ایک شخص فلاں گھرانے میں پیدا ہوا ہے، اس لیے پست ہے، یہ غلط بات ہے۔ انسان کو اللہ تعالی نے عظمت دی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلا۔

(بنی اسرائیل: ۷۰)

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔''

یہ اللہ کا کرم ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں انسانوں ہی کے لیے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ کہا ہے۔ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوسکتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کو محترم بنایا ہے اور دنیا کے اندر اسے ذمہ دارانہ حیثیت دی ہے۔

لٹریچر سے فائدہ اٹھائیے

بعض چیزوں کے بارے میں آپ کو احساس ہوگا کہ ہمیں لٹریچر کی ضرورت ہے۔ مولانا مودودیؒ کے بہت سے مضامین اور کتابچے آپ کو ایسے ملیں گے جو اس موضوع پر آپ کی رہنمائی کریں گے۔ مثلاً 'عقل کا فیصلہ، سلامتی کا راستہ، بناؤ اور بگاڑ''۔ بناؤ اور بگاڑ میں تو کچھ وقتی حالات کا اثر نظر آتا ہے، لیکن 'سلامتی کا راستہ' یا 'عقل کا فیصلہ' میں آپ دیکھیں گے کہ عمومی باتیں کہی گئی ہیں۔ اسی طرح 'زندگی بعد موت' نامی کتابچہ سے بھی ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میرا ایک کتابچہ 'وحدت بنی آدم' کے نام سے ہے۔ وہ اردو میں تو چھپ ہی رہا ہے، اس

کے علاوہ انگریزی، ہندی اور دیگر کئی علاقائی زبانوں میں بھی شائع ہورہا ہے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس موقع پر جو باتیں عرض کی گئی ہیں، ان پر مجھے بھی اور آپ کو بھی غور کرنے کی توفیق دے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

ملک وملت کے نازک مسائل
اور ہماری ذمہ داریاں
مولانا سید جلال الدین عمری

یہ کتاب مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی اور سہ روزہ دعوت نئی دہلی میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ملک کے موجودہ حالات میں ملت اسلامیہ ہند کے لیے واضح رہ نمائی موجود ہے۔

اس میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

- ☆ جدید ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل
- ☆ کچھ ہم سب کے سوچنے کی باتیں
- ☆ ملک کے موجودہ حالات
- ☆ ہندوستان کا قدیم طبقاتی نظام
- ☆ برصغیر کی اسلامی تاریخ
- ☆ مسلمانوں کا ماضی قریب، حال اور مستقبل
- ☆ امت مسلمہ ہند کے لیے صحیح لائحۂ عمل
- ☆ دعوتِ حق۔ فریضۂ ملت
- ☆ دعوت کا اسلوب
- ☆ اللہ کا دین آج آپ سے کیا چاہتا ہے؟

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، D-307، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵
صفحات: ۹۶، قیمت ۳۲ روپے

صوفیانہ تفسیری رجحان کا ارتقا

حافظ محمد احسن رضا

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا معجزانہ کلام ہے۔ اس کی زبان عربی مبین ہے۔ یہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر تقریباً تیئس (۲۳) سال کی مدت میں نازل ہوا۔ آپؐ نے بتایا کہ قرآن کریم کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ایک مطلع (بلندی)۔ آپؐ جہاں ضرورت محسوس کرتے تھے وہاں ظاہری مفہوم کے ساتھ باطنی معانی بھی سمجھا دیا کرتے تھے۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں آیات ربانی کی دونوں قسم کی تعبیریں کی جاتی تھیں۔ تکمیلِ دین کی آیت کا ظاہری مفہوم باعث مسرت تھا کہ دین مکمل کر دیا گیا، لوگ اس پر بہت خوش ہوئے، مگر اسی آیت کے باطنی مفہوم میں حضرت ابوبکرؓ کو آں حضور ﷺ کی جدائی کا صدمہ محسوس ہوا اور وہ رونے لگے۔

اسلام کے جو احکام ہماری ظاہری زندگی سے متعلق ہیں وہ علم فقہ کا موضوع ہیں اور جو احکام ہمارے باطن کی پوشیدہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں وہ علم تصوف میں بیان کیے جاتے ہیں۔ صوفیانہ تفسیر کے لیے ضروری ہے کہ عربی لغت سے واقفیت کے ساتھ خداداد دانش اور بصیرت کی نعمت بھی میسر ہو اور صوفیانہ مفہوم نہ تو عربی زبان کے اصول وقواعد سے متصادم ہو اور نہ کوئی ایسی نص موجود ہو۔ ان شرائط پر پوری اُترنے والی تفسیر صوفیانہ تفسیر ہے اور اس کو اشاری تفسیر بھی کہتے ہیں۔[۱]

صوفیانہ تفسیر سے مراد ہے اصحاب تصوف کا حاصل شدہ پوشیدہ اشارات کی مدد سے قرآن کریم کی ایسی تفسیر کرنا جو اُس کے ظاہری مفہوم کے خلاف تو ہو، مگر اس کے ظاہری اور باطنی مفہوم میں جمع اور تطبیق ممکن ہو۔[۲]

صوفیانہ تفسیر کے ارتقائی مراحل

صوفیانہ نظریات دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان پر مرور ایام سے فلاسفہ، متکلمین اور فقہاء نے اثر ڈالا اور ہر سہ کے اثرات سے ان نظریات میں تغیر رونما ہوا اور اشاری تفسیر مختلف مراحل سے گزری۔ ڈاکٹر ذہبی کے مطابق صوفیانہ تفسیر کے ارتقاء کے مراحل درج ذیل ہیں:

۱۔ ظاہری پر اشاری کے تفوق کا دور
۲۔ خالص اشاری دور
۳۔ اشاری اور نظری کے امتزاج کا دور
۴۔ خالص نظری دور
۵۔ اشاری پر ظاہری کے غلبے کا دور

ظاہری پر اشاری کے تفوق کا دور

اس دور کے مشہور مفسر سہل تستری ہیں۔ ان کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ علی ہجویریؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ھو جمع بین الشریعۃ و الحقیقۃ''[۳]۔

'وہ شریعت اور حقیقت (یعنی تصوف) کے جامع تھے'۔

ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

ان کا پورا نام سہل بن عبداللہ، کنیت ابو محمد اور نسبت تستری ہے۔ تستر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ عظیم عارف باللہ اور زہد و تقویٰ میں عدیم المثال تھے۔ ان کی ملاقات مکہ میں ذوالنون مصری سے ہوئی۔ کافی عرصہ تک بصرہ میں قیام کیا۔ ۲۷۳ھ یا ۲۸۳ھ میں وفات پائی۔[۴]

تستری کا قول ہے کہ ہر آیت قرآنی کے چار معنی ہیں:

(۱) ظاہری (۲) باطنی (۳) حد (اخلاق) (۴) مطلع (عارفانہ)

آپ کی تفسیر کا نام 'تفسیر القرآن العظیم' ہے، جو ایک جلد پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف چیدہ چیدہ آیات کی شرح اور توضیح کی گئی ہے۔

اس تفسیر میں مؤلف ظاہری اور باطنی دونوں معانی بیان کر دیتا ہے۔ بعض جگہوں پر صرف ظاہری معنی بیان کیی گئے ہیں تو کہیں صرف اشاری تفسیر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ گویا یہ ظاہری اور اشاری تفسیروں کا خوب صورت امتزاج ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سہل رحمۃ اللہ علیہ جہاں خالص اشاری مفہوم بیان کرتے ہیں وہ اکثر سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے۔ جیسے 'الم' کی تفسیر میں انھوں نے لکھا ہے کہ الف سے اللہ، لام سے جبرئیل اور میم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، گویا اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی، جبرئیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھائی ہے۔

اسی طرح آیت 'فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' (البقرۃ: ۲۲) 'سو نہ ٹھہراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو'۔ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

انداد کے معنی ''ضد اور مخالف'' کے ہیں۔ نفس امارہ سب سے بڑا مخالف ہے، جو ہدایات خداوندی کے برعکس لوگوں کو خواہشاتِ نفس کی پیروی کی تلقین کرتا ہے۔ ان کے نزدیک 'انداد' کا مفہوم وسیع ہے۔ اس میں سے وہ 'نفس امارہ' کو بھی شامل کرتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ یہ آیت اس معنی میں نازل نہیں ہوئی، مگر جو معنی انھوں نے مراد لیا ہے، وہ مقصد نزول سے مطابقت رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ بات آیت کی تفسیر کے طور پر نہیں، بلکہ 'ند' کے لغوی معانی 'شریک' اور 'مخالف' پر قیاس کر کے نفس امارہ کے لیے بیان کیے ہیں۔

خالص اشاری تفسیر کا دور

اس دور کے مشہور مفسر شیخ سلمی نیشاپوری ہیں۔ ان کا اسم گرامی محمد بن حسین، کنیت ابوعبدالرحمن اور نسبت ازدی وسلمی ہے۔ ۳۳۰ھ میں خراسان میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے صوفی اور شیخ طریقت تھے۔ طریقِ سلف پر گام زن رہے۔ تصوف اپنے والد محترم سے اخذ کیا۔ علم حدیث میں مہارت اور بصیرت رکھتے

تھے۔ ۴۰ برس تک حدیث کے درس میں مشغول رہے۔ عراق، نیشاپور اور حجاز میں گھوم پھر کر حدیثیں لکھیں اور ایک کتاب مرتب کی۔ حفاظ حدیث میں سے ابوعبداللہ حاکمؒ اور ابوالقاسم قشیری نے آپ سے استفادہ کیا تھا۔ تصوف، تاریخ، حدیث اور تفسیر کے علوم سے متعلق سو (۱۰۰) سے زائد کتب کا ذخیرہ چھوڑا۔ ۵؎

یہ تفسیر ایک بڑی ضخیم جلد میں ہے۔ تمام قرآنی سورتوں پر مشتمل ہے، مگر تمام آیات کی تفسیر نہیں کی گئی ہے۔ پوری تفسیر 'اشارات' پر مبنی ہے، ظاہری تفسیر سے بالکل تعرض نہیں کیا گیا ہے، مگر مولف اس کے منکر بھی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اہل الظاہر کی تفسیر کے قائل ہیں، لیکن خود صرف صوفیہ کے طریقے پر تفسیر قلم بند کرنا چاہتے ہیں۔ ۶؎

'الم' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''اس کا الف 'الوا حدنیۃ' سے، لام 'لطف' اور میم 'الملک' سے ماخوذ ہے، پھر اس کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کہنا ہے کہ جو شخص سب علائق و اغراض کو چھوڑ کر مجھے پانا چاہتا ہے، اسے لطف و کرم کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، اُس کو غلامی کی پستی سے نکال کر ملک اعلیٰ پر فائز کرتا ہوں، جس سے مالک الملک کے ساتھ ربط و اتصال مراد ہے۔ ۷؎

اشاری اور نظری تفسیر کے امتزاج کا دور

اس دور کا آغاز مفسر ابومحمد روز بہان سے ہوا ہے۔ ان کا نام 'ابومحمد روز بہان بن ابونصر بقلی شیرازی ہے۔ ان کی وفات ۶۰۶ھ میں ہوئی۔''

ان کی تفسیر 'عرائس البیان فی حقائق القرآن' اشاری طرز کی ہے۔ وہ اگرچہ ظاہری تفسیر کے قائل ہیں، جیسا کہ مقدمہ میں انھوں نے خود ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے اپنی تفسیر میں صرف اشاری تفسیر پر اکتفا کیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنی تفسیر میں وہ تمام حقائق اور معانی یکجا کر دیے ہیں جو خداوند قدوس کی طرف سے اُن پر القاء کیے گئے تھے۔

مؤلف نے تفسیر کے ضمن میں جو نادر اور عجیب و غریب معانی بیان کیے ہیں

وہ سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مثلاً آیت ’’وَ کُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِہٖ مُؤْمِنُوْنَ ‘‘ (المائدۃ: ۸۸) کی تفسیر میں انھوں نے لکھا ہے:

’’حلال وہ ہے جو عارف کو خوانِ غیب سے انسانی تکلیف کے بغیر پہنچ جائے اور طیب ہر وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے شوق میں اُس کے دل کو قوت دے اور اُس کے جلال قدیم و دائم کو یاد دلائے۔۸؎

اس تفسیر میں حلال وطیب کی تشریح جس انداز میں کی گئی ہے وہ اس پورے علم سے مختلف ہے جو صحابہ اور فقہائے امت نے بیان کی ہے۔ اس تفسیر میں تصوف کی مشکل اصطلاحات کی بھرمار ہے۔ مؤلف کے پیش کردہ معانی کو نادر تو کہا جا سکتا ہے، مگر ان کے معانی کو مرادِ الٰہی قرار دینا مشکل ہے۔

خالص نظری تفسیر کا دور

اس دور کے بانی شیخ محی الدین ابن عربی ہیں۔ ۱۷ رمضان المبارک ۵۶۰ھ کو اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کو شیخ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ ۵۶۸ھ میں آٹھ سال کی عمر میں اشبیلیہ (اندلس) آ گئے تھے۔ انھوں نے کئی ممالک کی سیر و سیاحت کی، پھر دمشق میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ۶۳۸ھ میں وفات پائی۔

ابن عربی کی تصانیف کے حوالے سے متضاد بیانات ملتے ہیں، بعض نے کل کتب کی تعداد پانچ سو (۵۰۰)، بعض نے چار سو (۴۰۰) اور بعض نے دوسو چوراسی (۲۸۴) بتائی ہے۔ جب کہ ان کی فہرست میں وفات سے چھ سال پہلے کی دوسو اکیاون (۲۵۱) کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔۹؎

ابن عربی کی سب سے ضخیم اور اہم کتاب ’الفتوحات المکیۃ فی معرفۃ الأسرار المالکیۃ والملکیۃ‘ مکہ میں ۶۲۹ھ میں لکھی گئی۔ دوسری اہم کتاب ’فصوص الحکم‘ ۶۲۷ھ میں دمشق میں تحریر کی گئی۔ ابن عربی کے متصوفانہ فلسفے کا اُصول ’وحدۃ الوجود‘ ہے۔ وہ پہلے مسلمان مفکر ہیں جنہوں نے کلامِ الٰہی (الکلم) اور ’انسان کامل‘ کا نظریہ پیش کیا۔

ابن عربی کی تفسیر کو اشاری اور نظری تفسیر کا معجون مرکب کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی نسبت کے اعتبار سے بالغ مقدار نظری تفسیری اقوال کی ہے۔ اس میں ظاہری تفسیر کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔

ابن عربی نے تفسیر کی بنیاد 'وحدۃ الوجود' کے نظریہ پر رکھی ہے۔ اس سے وہ یہ مراد لیتے تھے کہ وجود درحقیقت ایک ہی ہے اور وہ ذات باری تعالیٰ ہے، البتہ ظاہری حواس کو کثرت نظر آتی ہے۔ وحدۃ الوجود سے ابن عربی نے وحدتِ ادیان کا نظریہ ایجاد کیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ ادیان و مذاہب میں کچھ فرق نہیں، خواہ وہ آسمانی ہوں یا غیر آسمانی۔ اس لیے کہ سب مذاہب میں الٰہ کی عبادت کی جاتی ہے، جو انسانوں کی شکل میں متشکل نظر آتا ہے۔ عبادت کا مقصد صرف یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی وحدتِ ذاتیہ کا تحقّق کر سکے۔[۱۰]

مثال کے طور پر ابن عربی آیت 'والٰھکم الٰہ واحد' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مذکورہ آیت مبارکہ میں اہل اسلام اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ چوں کہ ان لوگوں کے پیشِ نظر بھی اللہ ہی کا تقرب ہوتا ہے، اس لیے گویا وہ بھی اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ جب اُنہوں نے خود اعتراف کیا کہ ہم غیر اللہ کی عبادت تقرب الٰہی کے حصول کے لیے کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا الٰہ اور مشرک کا الٰہ، جس کے توسط سے وہ اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے دونوں ایک ہی ہوئے۔ دونوں خدا کی احدیت پر متحد ہو گئے، اسی لیے قرآن میں 'والٰھکم' جمع کے الفاظ ہیں''۔

اگر یہ تفسیر مقصود ربانی کے مطابق ہے تو پھر کون سی توضیح وتشریح کے خلاف ہو گی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بات کو توڑ مروڑ کر وحدۃ الوجود کے عقیدے کے مطابق بنایا گیا ہے، یعنی اس میں پہلے سے طے شدہ مقدمات کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس تفسیر کو رد کیا جاتا ہے۔

اشاری تفسیر پر ظاہری کے غلبے کا دور

تفسیر اشاری پر ظاہری تفسیر کے غلبے کے دور کے ایک نمائندہ مفسر علامہ آلوسی

ہیں ۔ان کا پورا نام سید محمود آفندی، کنیت ابوالثنائ ،لقب شہاب الدین اورنسبت آلوسی بغدادی ہے ۔آلوس ایک گاؤں کا نام ہے، جوملک شام اور بغداد کے درمیان واقع ہے ۔ آپ ۱۲۱۷ھ میں بغداد کے محلہ ُکرخ' میں پیدا ہوئے ۔عراق کے علماء میں نمایاں مقام پر فائز تھے ۔منقولات اور معقولات کے عالم اور عدیم المثال محدث اور مفسر تھے ۔آپ نے اپنے والد محترم کے علاوہ شیخ خالد نقشبندی اور شیخ علی سوہدی سے بھی کسب فیض کیا۔ ۱۲۴۸ھ میں آپ کو مفتی احناف مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے آپ مدرسہ مرحانیہ کے ناظم اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے ۔یہ وہ منصب تھا جس پر شہر کا سب سے بڑا عالم مقرر کیا جاتا تھا۔شوال ۱۲۶۳ھ میں افتاء کے منصب سے الگ ہو کر تفسیر قرآن کی تالیف میں لگ گئے۔آپ مسلکاً شافعی تھے،مگر اکثر مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتے تھے ۔ آخر عمر میں آپ کا رجحان اجتہاد کی طرف ہو گیا تھا۔آپ نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں،جن میں سے تفسیر ُروح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی' بھی ہے ۔جمعہ المبارک،۲۰ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔[۱۱]

آلوسی نے اپنی تفسیر کو روایت اور درایت دونوں اعتبار سے سلف وخلف کے اقوال کے مطابق بنانے کی پوری کوشش کی ہے ۔آپ ابوحیان، زمخشری، بیضاوی، رازی اور دیگر مفسرینکے اقتباسات نقل کرتے ہیں،مگران کومن وعن قبول کرنے کے بجائے ان پر پورا محاکمہ کرتے ہیں۔ضرورت پڑنے پر کسی مفسر کو ہدفِ تنقید بنانے سے نہیں چوکتے،مثلاً فقہی مسائل میں امام رازیؒ پر شدید نقدو جرح اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی حمایت کرتے ہیں ۔صحابہ کرامؓ کے حق میں تاویل کرتے ہیں اور پورے زور کے ساتھ کبار صحابہ کے بارے میں معتزلہ اور شیعہ وغیرہ کے خیالات کو غلط قرار دیتے ہیں۔

آلوسی صوفیانہ تفسیر کی بنیاد ظاہر، باطن ، حد اور مطلع پر رکھتے ہیں ۔ یہ معیار ان صوفیہ کا قائم کردہ ہے جنہوں نے اشاری تفسیر لکھنے کا آغاز کیا تھا، مثلاً تستری اور سلمی اور ان کے ہم عصر صوفیۂ کرام ۔انھوں نے اشاری تفسیر سے غلو کو دور کرنے کی اسی طرح کوشش کی ہے،جس طرح ظاہری تفسیر کی خامیوں کو درست کرنے کی سعی کی

ہے۔ وہ کسی پر طنز کرنے کے بجائے محض غلط بات کو صحیح اور درست انداز میں تحریر فرما کر اپنے مدعا اور مقصد کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ [۱۲]

انھوں نے صوفیانہ تفسیر کو قرن اول کی اشاری تفسیر کے تابع بنایا ہے، ظاہری اور اشاری معانی میں تطبیق کی پوری کوشش کی ہے، نظری تفسیر کو نظر انداز کیا ہے، جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں اشاری تفسیر کی ہے، مگر ظاہری کے مقابلے میں اس کو ضمنی اور ثانوی حیثیت دی ہے۔ ان کے نزدیک سب سے پسندیدہ طریقہ تفسیر بالماثور رہے۔

موجودہ دور میں صوفیانہ تفسیری رجحان کا نمونہ مولانا شرف علی تھانوی (م ۱۹۴۳ئ) کی تفسیر 'بیان القرآن' میں 'مسائل السلوک' کے عنوان سے ملتا ہے۔ مولانا تھانوی قرآن کریم کے مترجم اور مفسر تھے، قرآن کریم کے علوم وحکم کے شارح تھے، آپ نے قرآن حکیم پر کیے گئے شکوک وشبہات کے جوابات دیے ہیں۔ آپ صوفی بھی تھے۔ آپ نے تصوف کے اسرار وغوامض کو فاش کیا اور شریعت وطریقت کے مابین مدتوں سے جاری جنگ میں صلح کرادی، بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کر دیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں میں بیان کی جاتی ہے، جو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں۔

آپ کے علمی کارناموں میں سب سے اہم تفسیر 'بیان القرآن' ہے۔ یہ دو(۲) جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ نے علم سلوک اور تصوف کے موضوع پر کم وبیش بیالیس (۴۲) کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں تفسیر بیان القرآن میں بھی مسائل السلوک کے عنوان سے مسائل تصوف کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے قرآن کریم کی تمام آیات کی اشاری تفسیر نہیں کی، مگر کوئی ایک سورت بھی ایسی نہیں جس کی کم از کم ایک آیت کی صوفیانہ تفسیر نہ کی ہو۔ [۱۳]

مولانا تھانوی کی اشاری تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک دین متین ہی کے ظاہر و باطن کا نام شریعت وطریقت ہے۔ جس طرح ظاہری اعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرائض وواجبات مقرر ہیں، اسی طرح باطنی اعمال کے

لیے بھی فرائض و واجبات ہیں۔آپ حقوق العباد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔آپ کے نزدیک خاندانی زندگی سے مثبت تعلقات کا نام تصوف ہے۔اگر کوئی اس میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ سے تعلق کی ہوا تک نہیں لگی، خواہ وہ تمام عمر رسمی مجاہدے کرتا رہے۔آپ کی تفسیر سے مترشح ہوتا ہے کہ نوافل اور وظائف میں سر مارنے سے بہتر ہے کہ اللہ کی مخلوق کو ناراض نہ کیا جائے۔آپ نے علم سلوک اور تصوف کو جاہل اور مصنوعی صوفیہ، اہل بدعت کی تلبیس، ہندوؤں کے یوگ اور ویدانت کے اصولوں سے پاک رکھنے پر زور دیا ہے۔[۱۴]

☆☆☆

حواشی و مراجع

۱۔ شاطبی، ابواسحق، الموافقات فی اصول الشریعۃ، المکتبہ التجاریۃ الکبری، ۱۹۷۰ء

۲۔ ذہبی، محمد حسین، التفسیر والمفسرون، مکتبہ وھبیۃ، عابدین، مصر، ۱۹۸۵، ۲/ ۴۴

۳۔ کشف المحجوب: ص ۱۲۰

۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۰ئ طبع اول، ۱۱/ ۴۷۴ تا ۴۷۶

۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۱۹۱

۶۔ التفسیر والمفسرون، ص ۳۶۸۔۳۶۹

۷۔ التفسیر والمفسرون، بہ حوالہ السلمی، ابوعبدالرحمن محمد بن حسین، حقائق التفسیر، ص ۹

۸۔ عرائس البیان، ج ۱، ص ۱۹۰

۹۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۶۰۶

۱۰۔ احمد شنطاوی، حاشیہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ: ۱/ ۳۳۳، لجنۃ الترجمۃ ۱۹۳۳ء

۱۱۔ التفسیر والمفسرون، ص ۳۳۶

۱۲۔ آلوسی، محمود آفندی، روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی۔ ۱/ ۷، ۵

۱۳۔ عارفی محمد عبدالحی، ماثر حکیم الامت، ادارۂ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۶ئ، ۱/ ۴۷۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۱۲۔ ۳۱۳

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری، تحمل و برداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن و حدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت: ۱۸۵/- روپے

اسلامی ریاست میں ادارۂ احتساب
اہمیت، حدود اور شرائط

مولانا محمد جرجیس کریمی

اسلام میں عدل و انصاف کی جو اہمیت ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں جس اہتمام سے اس کا نفاذ چاہتا ہے، اس کے پیش نظر، ضروری تھا کہ وہ اس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کرے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے لیے ذہنی بیداری پیدا کی، عدل و انصاف کو ہر شخص کی ضرورت قرار دیا، انفرادی و اجتماعی ہر سطح پر اس کے نفاذ کی تعلیمات دیں، دوست و دشمن ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف بروئے کار لانے کا حکم دیا۔ مزید برآں اس نے احکام الٰہی کے تحت دین و دنیا کے معاملات کی انجام دہی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائی اور مختلف انسانی طبقات میں عدل و انصاف کے قیام کو اسلامی ریاست کا نصب العین قرار دیا۔

اسلامی معاشرہ میں عدل و انصاف نافذ کرنے والے ادارے

عدل و انصاف کا حصول محض حکم راں کی خواہش یا کوشش سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے کچھ معاون اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، جو درج ذیل ہے:

۱۔ قضا ۲۔ افتائ ۳۔ شرطہ ۴۔ حسبہ ۵۔ دیوان مظالم

۱۔ قضا: قضا کا مطلب ہے عدلیہ، یعنی قانون کی حکم رانی۔ متمدن معاشرہ، اجتماعی شیرازہ بندی، حقوق کا تحفظ، مظالم کی روک تھام اور عدل و انصاف کا استقرار قانون کی بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ اسلام میں عدل و انصاف کی جو اہمیت ہے اسی کے بہ قدر اہمیت نفاذ قانون اور قیام عدل کے اس ادارے یعنی قضا یا عدالت کو

حاصل ہے۔ اسلام میں کوئی شخص قانون سے بالا تر نہیں ۔ اس لیے قاضی کے اختیارات کا دائرہ رعایا کے تمام طبقات اور حکومت کے جملہ افسران، حتیٰ کہ سربراہ مملکت تک محیط ہے۔ قاضی محض احکام الٰہی کا پابند ہوتا ہے، وہ کسی اور کی پابندی قبول نہیں کرتا۔

۲۔ افتا: اسلام کی تعلیمات کے مطابق اللہ کی ذات اقدس صرف محدود مذہبی معنیٰ میں معبود نہیں بلکہ وسیع تر معنیٰ میں سیاسی اور قانونی اعتبار سے حاکم، مطاع اور واضع قانون بھی ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت کے قوانین کا ماخذ قرآن مجید اور سنت نبویؐ کو قرار دیا گیا ہے۔ ہر نزاع میں فیصلے کے لیے انہی دونوں ماخذ ومصادر کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے:

> يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ أَطِيْعُواْ اللّهَ وَأَطِيْعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِيْ الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيْلا(النسائ:۵۹)
>
> ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہوں ۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو ۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقۂ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے''

قرآن وحدیث کی طرف رجوع کا یہ عمل استفتاء کہلاتا ہے اور ان مسائل کا شرعی حل پیش کرنا ادارۂ افتاء کا کام ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں عدل وانصاف کے قیام کے لیے قضا کے بعد افتاء کی اہمیت ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے افتاء قضا پر بھی فوقیت رکھتا ہے، کیوں کہ پہلے شریعت کا حکم جاننے کی اہمیت ہے پھر اس پر عمل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عمل کے بارے میں علم نہ ہو تو اسے اہل علم سے جاننے کا حکم دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اہل علم کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو احکام الٰہی سے واقف کرائیں ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبة: ۱۲۲)

''مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے، تاکہ وہ پرہیز کرتے''۔

۳۔شرطہ: یعنی محکمۂ پولیس ۔ انسانی تاریخ میں ہابیل اور قابیل کے عہد سے ظلم وتشدد اور جرائم کے ارتکاب کا آغاز ہوگیا تھا۔ سوسائٹی کے ارتقاء کے ساتھ جرائم اور مظالم میں بھی ترقی اور اضافہ ہوتا گیا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مظالم کو روکنے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے مستقل ایک ادارے کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں منظم یا غیر منظم پولیس کا وجود رہا ہے، جو سماج کے ساتھ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آج کی موجودہ تنظیمی ہیئت میں موجود ہے ۔

اسلامی ریاست میں ایک منظم اجتماعی ادارے کے اعتبار سے شرطہ کا قیام عہد فاروقی کی یادگار ہے ۔ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں پولیس کا باقاعدہ ادارہ موجود نہیں تھا۔ مختلف ذرائع سے اس کی ضرورت کی تکمیل ہوتی تھی۔ عہد فاروقی میں کثرت فتوحات اور وسعت تمدن کے باعث امن و مان کے استقرار کا مسئلہ اہم ہوگیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ادارہ شرطہ کی تشکیل کی، پھر حضرت عثمانؓ نے صاحب شرطہ کا منصب جاری کیا۔ بعد میں اسلامی ریاست میں یہ ادارہ اور منظم ہوتا گیا۔

شرطہ یعنی محکمۂ پولیس کے ذمے جو فرائض ہوتے ہیں، انھیں چار حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) انسداد جرائم، یعنی وقوع سے پہلے جرائم کی روک تھام، اس کے لیے پولیس کا گشت اور مشتبہ افراد کی نگرانی شامل ہے۔ (۲) انکشاف جرائم، یعنی وقوع شدہ جرائم کا کھوج اور سراغ لگانا اور مجرموں کی گرفت کرنا۔ (۳) تفتیش جرائم، یعنی وقع شدہ جرائم میں مجرموں کے خلاف ثبوت فراہم کرنا۔ (۴) پیروئ مقدمات،

یعنی مجرموں کو قرار واقعی سزا دلانا۔ یہ چار اہم کام شرطہ کے ذمہ ہیں، جن کی ادائی کے بغیر اسلامی ریاست میں عدل وانصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے۔

(۴) حسبہ: یعنی ادارۂ احتساب۔ اس کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ ہر مسلمان امر بالمعروف ونہی اعن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ دوسرے یہ کہ اس فریضہ کی اجنام دہی کے لیے حکومت افراد کو متعین و مامور کرے۔ ادارۂ حسبہ کی اہمیت اسلامی ریاست کے آغاز ہی میں محسوس کر لی گئی تھی۔ چنانچہ عہد رسالت میں رسول اکرم ﷺ بہ ذات خود اس اہم کام کو انجام دیتے تھے۔ چنانچہ آپؐ وقتاً فوقتاً بازار کا چکر لگاتے اور کوئی غلط کام، خاص طور پر خرید وفروخت کے حوالے سے دیکھتے تو اس کی اصلاح فرماتے تھے۔ بعد میں خلفاء راشدین نے بھی اس فریضہ کو انجام دیا اور اس کے لیے بعض افراد کو مقرر فرمایا۔ بعد کے ادوار میں اسلامی ریاست میں ہمیشہ یہ ادارہ کارفرما رہا ہے۔

ادارۂ حسبہ کا دائرہ کار دینی واخلاقی، معاشرتی وتمدنی، اقتصادی ومعاشرتی اور قانونی وعدالتی تمام امور ومسائل تک وسیع ہے۔

(۵) دیوان المظالم: اس سے مراد یہ ہے کہ آپس میں ظلم وتعدی کرنے والے ہر دو فریق کو جبراً عدالت میں پیش کر کے ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ اگر وہ انکار کریں تو انھیں ڈرا دھمکا کر یہ کام کیا جائے۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد جبر و استبداد کا خاتمہ ہے۔ خواہ اس کا ارتکاب کرنے والے ارباب اقتدار اور عمال حکومت ہوں یا قاضی اور اس کے ماتحت افراد یا عام رعایا۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد قانون کی حکم رانی، عدل وانصاف اور ظلم کا استیصال ہے۔ دیوان المظام اور ادارۂ حسبہ کے درمیان دو پہلوؤں سے مشابہت اور دو پہلوؤں سے فرق پایا جاتا ہے:

۱۔ دیوان المظالم ان امور ومعاملات کی سماعت کرتا ہے جن کی انجام دہی سے قاضی عاجز وکم زور ہو، جب کہ ادارۂ حسبہ ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو چھوٹے ہوں اور قاضی کی عدالت میں ان کا پیش کرنا مناسب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ

دیوان مظالم کے ذمے دار کا درجہ قاضی سے برتر ہوتا ہے، جب کہ حسبہ کی حیثیت قاضی سے کم تر اور اس کے تابع ومعاون کی ہوتی ہے۔

۲۔ دیوان مظالم کے سربراہ کو مقدمات کی سماعت اور فیصلے دینے کا پورا اختیار ہوتا ہے، جب کہ محتسب کو ایسا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ دیوان المظالم ایک برتر ادارہ ہونے کی حیثیت سے قاضی اور محتسب دونوں کا نگراں ہوتا ہے۔

ادارۂ احتساب کی اہمیت وضرورت اور اس کے دائرۂ کار پر امام ابن تیمیہؒ نے اپنی معروف کتاب 'الحسبۃ فی الاسلام' میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس مضمون میں اس کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ [راقم کے پیش نظر دار الفکر بیروت کا شائع شدہ نسخہ رہا ہے]

تمام سرکاری مناصب کا مقصد اقامت دین:

امام ابن تیمیہ کے نزدیک سرکاری مناصب امانت ہیں اور امانت کو امانت داروں کے حوالے کرنا واجب ہے۔ اسی طرح مناصب کا بنیادی مقصد اقامت دین ہے۔ ان سے دین قائم کرنے کا کام لیا جائے گا۔ تبھی ان کا صحیح استعمال ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو امانت میں خیانت ہوگی۔ امام موصوف لکھتے ہیں:

أصل ذالک أن تعلم ان جمیع الولایات فی الاسلام مقصودها أن یکون الدین کله وان تکون کلمة الله هی العلیا (الحسبة:۳)

''امام موصوف آگے تحریر فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو پیدا کیا، اسی وجہ سے اس نے کتابیں نازل کیں اور انبیاء ورسل کو مبعوث فرمایا اور اسی بات پر رسول اکرمؐ، صحابہؓ اور مسلمانوں نے کفار ومشرکین اور یہود ونصاریٰ سے جہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات:۵۶)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِکَ مِن رَسُولٍ إِلَّا نُوحِیْ إِلَیْہِ أَنَّہُ لَا إِلَہَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (الانبیائ:۲۵)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں۔ پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو''۔

ایک جگہ اور ارشاد ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ أُمَّۃٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّٰہَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ (النحل:۳۶)

''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو''۔

ان تمام آیات میں اللہ کی عبادت کا حوالہ دیا گیا ہے اور اللہ کی عبادت اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔

اجتماع کے بغیر انسانی زندگی قائم نہیں رہ سکتی

امام موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ انسانوں کی مصلحتیں، خواہ وہ دنیا کی ہوں یا آخرت کی، اجتماع اور باہمی تعاون و تناصر، یعنی ایک دوسرے کی مدد کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی مخلوق ہے، یعنی وہ سماج بنا کر رہتا ہے، جس میں وہ نفع حاصل کرتا ہے یا ضرر سے بچتا ہے۔ چنانچہ اس اجتماع کو چلانے کے لیے ایک حکم راں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا میں تمام مذاہب کے ماننے والے، خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا کفار و مشرکین، اس حقیقت کو مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اجتماع کے معاملات اپنے حکم رانوں کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ امام موصوف رقم طرز ہیں:

فجمیع بنی آدم لابدّ لھم من طائفۃ آمرو ناہٍ فمن لم یکن من اھل الکتاب الا لھیۃ و لا من أھل دین فانھم یطیعون ملوکھم فیما یرونانہ یعود لمصالح دنیاھم (الحسبۃ:۴)

''تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے ایسا گروہ جو ان کو حکم دے اور روکے۔

پس جو لوگ اہل کتاب میں سے یا آسمانی دین کے ماننے والے نہیں ہیں، وہ بھی اپنے بادشاہوں کی اطاعت کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کر رہے ہیں‘‘۔

معاشرہ کے قیام کے لیے آمر و ناہی (حکم دینے والا/حکم راں) کی ضرورت ناگزیر ہے۔اسی وجہ سے اسلامی تعلیمات میں حکم رانوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے کم سے کم اجتماعیت میں بھی اطاعت امیر کی تلقین کی گئی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذاخرا ج ثلاثۃ فی سفر فلیو مرو ا احدھم (ابو دائود)

’جب تین لوگ سفر پر نکلیں تو ان میں سے ایک کو اپنا امیر بنالیں‘۔

امام ابن تیمیہؒ رقم طراز ہیں کہ جب سب سے چھوٹی جماعت پر واجب ہے کہ امارت قائم کرے تو ظاہر بات ہے کہ بڑی جماعت اور معاشرہ اور پوری امت کے لیے یہ کیوں واجب نہ ہوگا کہ وہ اپنے معاملات طے کرنے کے لیے امارت قائم کرے اور اپنے امیر (خلیفہ/حکم راں) کی اطاعت کرے۔ اسلام میں جملہ ولایات، مناصب اور عہدوں کا بنیادی مقصد امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔اس کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور اسی معاملے میں اہلِ ایمان کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔ارشاد ہے:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ (التوبۃ:۲۱)

’مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں‘۔

بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا قدرت رکھنے والے پر واجب ہے، بلکہ یہ فرض کفایہ ہے۔ اگر کچھ لوگ اس کو انجام نہ دیں تو فرض عین ہو جاتا ہے۔قدرت سے مراد حکومتی اختیارات ہیں، کیوں کہ اختیارات رکھنے والا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔

حکم راں پر واجب ہے کہ وہ حکومتی معاملات صاحب صدق و عدل کے ذریعہ طے کرے۔ اگر ایسا شخص نہ ملے جو ہر اعتبار سے معیاری ہو تو لوگوں میں جو اس کا زیادہ اہل ہو، اس سے کام لے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ''جس نے کسی شخص کو کوئی منصب دیا، حالاں کہ وہ جانتا تھا کہ اس عہدے کے لیے اس سے زیادہ اہل شخص موجود ہے تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی''۔ اگر مطلوبہ اہمیت کا حامل شخص موجود نہیں ہے تو درجہ بہ درجہ لوگوں سے خدمات حاصل کی جائیں گی۔ چنانچہ حسبہ کی ذمہ داریوں کی ادائی کے لیے بھی ضروری ہے کہ حاکم وقت، صاحب صدق و عدل کا تقرر کرے۔

محتسب کی ذمہ داریاں

ادارۂ حسبہ کے ذمہ جو کام ہیں ان میں اولین کام دینی امور کی انجام دہی کی تلقین کرنا ہے، مثلاً عوام الناس کو پنج وقتہ نمازوں کی تاکید کرنا، جو اس میں کوتاہی کرے اس کی گرفت کرنا، شرعی حدود کی خلاف ورزی کرنے والے کو پابند بنانا وغیرہ۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں نماز کی اولین اہمیت ہے۔ اس لیے کہ وہ دین کی بنیادوں میں سے ہے۔ نماز ایمان کے زبانی اقرار کا عملی ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معراج میں بغیر کسی واسطہ کے براہِ راست نبی کو خطاب کرکے اسے فرض قرار دیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے مرض الموت میں اس کی پابندی کی خصوصی وصیت فرمائی ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ خلفاء راشدین اپنے گورنروں کو نماز کی پابندی کرانے کی خصوصی تاکید فرماتے تھے۔

محتسب لوگوں کی جماعت اور جمعہ، سچ بولنے، امانت ادا کرنے کا بھی حکم دے گا اور منکرات، جھوٹ، خیانت، تجارت میں بدعنوانی، دھوکہ دھڑی، ملاوٹ سے روکے گا۔ خرید و فروخت میں دھوکہ دہی کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ قابل فروخت چیزوں کے عیوب کو چھپایا جائے، اسی طرح کھانے والی چیزوں میں ملاوٹ کی جائے، دیگر مصنوعات مثلاً کپڑوں، عطریات، سونے چاندی یا ہیرے و جواہرات میں ملاوٹ کی

جائے ، یا نقلی اور جعلی چیزوں کو اصلی بتا کر فروخت کیا جائے ۔منکرات کے مفہوم میں خرید و فروخت کے وہ معاملات شامل ہیں جو حرام کردہ ہیں، جیسے سود، جوا وغیرہ۔ محتسب خرید و فروخت کے ان تمام طریقوں پر نکیر کرے گا جو شریعت میں حرام اور ناجائز قرار دیے گئے ہیں۔

محتسب لوگوں کو ذخیرہ اندوزی سے بھی روکے گا اور انھیں مجبور کرے گا کہ وہ معروف قیمت پر اپنی اشیاء فروخت کریں، حتیٰ کہ اگر کہیں اضطرار کی کیفیت ہو تو صاحب مال کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ ثمن مثل (یعنی موجودہ قیمت) پر فروخت کرے ۔اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے متعین قیمت پر فروخت نہ کرے تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا۔

محتسب لوگوں کو مختلف پیشے اختیا کرنے کی بھی تلقین وتا کید کرے گا، کیوں کہ انسان فطری طور پر مختلف چیزوں کا محتاج ہوتا ہے، جیسے زراعت، کپڑوں کی بنائی، سلائی اور مکانوں کی تعمیر وغیرہ۔ ان چیزوں کی ضرورت ہر انسان کو پڑتی ہے اور یہ سارے کام تن تنہا کوئی فرد انجام نہیں دے سکتا، لہٰذا لوگوں کو یہ کام مل جل کر کرنا چاہیے۔ یہ تمام پیشے فرض کفایہ کے درجے میں ہیں ۔اگر کچھ لوگ ان کو انجام نہ دیں تو وہ فرض عین ہو سکتے ہیں ۔اس لیے محتسب لوگوں کو ان پیشوں کو اختیار کرنے کا حکم دے گا۔ اگر وہ آمادہ نہ ہوں تو انھیں مجبور کیا جائے گا۔ اس صورت میں ان کو معروف طریقے سے اجرت دی جائے گی یا پھر متعین قیمت پر تاجرانہ طریقے سے انھیں استعمال کرے گا۔

اشیاء کی قیمتوں کی تعیین کے سلسلے میں علماء کی دو رائیں ہیں: ایک رائے کے مطابق قیمتیں متعین نہیں کی جاسکتیں، جب کہ دوسری رائے کے مطابق ان کی تعیین کی جائے گی ۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے جو حلال تو ہو، مگر اس کی قیمت معلوم نہ ہو۔ جب تک کسی سامان کو فروخت کرنے والا اس کی قیمت نہ بتا دے اور خریدنے والا اس کی قیمت نہ جان لے ، اس وقت تک اس کی خرید وفروخت جائز نہیں۔

محتسب دینی امور میں بدعات کی ترویج و اشاعت اور تدلیس کے طریقوں

کی روک تھام کرے گا۔ مثلاً صحابہ کرامؓ کو سب وشتم کرنا، ائمہ وفقہاء کو برے الفاظ سے پکارنا، حکم رانوں کو نازیبا کلمات سے یاد کرنا، حدیث کا انکار کرنا، موضوع احادیث کو رواج دینا، دینی امور میں غلو کا اظہار کرنا، تقدیر کا انکار کرنا یا جادو ٹونا اور شعبدہ بازی میں مصروف ہونا وغیرہ۔ محتسب ان معاملات میں روک ٹوک کرے گا، یہاں تک کہ متعلق فرد توبہ پر آمادہ ہو جائے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کی تعزیر کی جائے گی۔ سزا اسی وقت نافذ ہوگی جب جرم ثابت ہو جائے، لیکن روک ٹوک جرم ثابت ہوئے بغیر محض شبہ کی بنیاد پر بھی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جو شخص جھوٹ بولنے میں مشہور ہو اس کی گواہی قبول کرنے میں احتیاط کی جائے گی۔ (الحسبۃ: ص ۲۹)

امام موصوف محتسب کی ان ذمہ داریوں کی وضاحت کے بعد لکھتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے تقاضے شرعی سزاؤں کے نفاذ کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، جیسا کہ کہا گیا ہے:

ان اللہ یزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (الحسبۃ: ص ۳۰)

'اللہ تعالیٰ حکومت کے ذریعہ ان چیزوں کی اصلاح کرتا ہے جن کی اصلاح قرآن کے ذریعہ نہیں ہو پاتی'۔

چنانچہ حدود وتعزیرات کو قائم کرنا ارباب حل وعقد کے اوپر واجب ہے۔ یہ سزائیں واجبات کے ترک اور محرمات کے ارتکاب پر دی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، جیسے چوری اور قذف کی سزا اور کچھ غیر مقرر کردہ ہیں، جن کو تعزیر کہا جاتا ہے۔ تعزیر کی مقدار اور نوعیت گناہ اور جرم کے مطابق طے کی جاتی ہے۔ یہ مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے، جیسے، ڈانٹ، پھٹکار، قید، جلاوطنی، مارنا پیٹنا وغیرہ۔ مارنے کی سزا واجب کے ترک پر دی جائے گی، جیسے ترکِ صلاۃ یا واجب حقوق کی عدم ادائی یا قرض کی عدم ادائی یا مغصوب (غصب شدہ) کی واپسی میں لیت ولعل یا امانت کی ادائی میں کوتاہی وغیرہ۔ کبھی ایک ہی بار مار لگائی جائے گی اور کبھی متعدد بار وقفے وقفے سے، یہاں تک کہ وہ اپنی اصلاح کرلے۔

تعزیر کی کم از کم کوئی حد نہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ حد کے بارے میں فقہاء کی تین آراء ہیں: بعض نے زیادہ سے زیادہ حد دس کوڑے قرار دی ہے۔ بعض کے نزدیک اس میں حدود سے کم یعنی انتالیس (۳۹) یا انیاسی (۸۹) کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ تیسری رائے یہ ہے کہ اس کے لیے پہلے سے طے نہیں کیا جائے گا، بلکہ بروقت اس کا فیصلہ ہوگا کہ مجرم کو کتنے کوڑے مارے جائیں۔ بہ ہر حال ان کی تعداد حد کے برابر یا اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ ایسا شخص جو فساد انگیزی میں مشہور ہو اور اسے قتل کیے بغیر اس کے فساد کو روکا نہ جاسکے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (الحسبۃ: ص ۳۱)

امام موصوف مزید آگے وضاحت فرماتے ہیں کہ مال کے ذریعہ بھی تعزیر کی جا سکتی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے بارے میں وافر دلائل موجود ہیں۔ جن لوگوں نے مال کے ذریعہ تعزیر کے مسئلہ کو منسوخ قرار دیا ہے ان کا موقف کم زور ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مال کے ذریعہ تعزیر کی جاسکتی ہے، جیسا کہ مختلف واقعات اور نصوص سے پتا چلتا ہے۔ مثلاً حدود حرم میں اگر کوئی شخص شکار کرے تو اس کی شکار کردہ چیز سلب کر لی جائے گی۔ اسی طرح شراب کے برتنوں کو توڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مسجد ضرار کو منہدم کرنے کا واقعہ بھی اس کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد دلائل موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کے ذریعہ تعزیر کی جاسکتی ہے۔ امام مالک، امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا یہی مسلک ہے۔ (الحسبۃ: ص ۳۲۔۳۱)

مال کے ذریعہ تعزیر کی ایسی شکلیں ہوں گی، جیسی بدنی سزاؤں میں ہوتی ہیں، مثلاً کبھی سزا جرم کے بدلہ میں ہوتی ہے، جیسے چور کا ہاتھ کاٹ دینا، کبھی آئندہ جرم کے انسداد کی غرض سے سزا دی جاتی ہے، جیسے قصاص۔ ایسے ہی مالی سزا کبھی منکر کے ازالے کے لیے ہوتی ہے، کبھی مال کو تلف کر کے سزا دی جاتی ہے، کبھی اس کی ہیئت تبدیل کر دی جاتی ہے، کبھی ملکیت تبدیل کر دی جاتی ہے، جیسے بتوں، مجسموں اور کھیل کود کے سامان کو تلف کر دینے کا حکم ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کو تلف نہ کر کے انھیں صدقہ کر دیا جائے گا، کپڑوں میں بنی جان دار کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے گا کہ وہ جان دار معلوم نہ ہوں

، جہاں تک ملکیت تبدیل کرنے کی بات ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے مسروقہ مال کے بقدر یا اس سے دوگنا مال بطور جرمانہ ادا کرنا، جیسا کہ ایک حدیث میں مروی ہے۔ جس شخص نے درخت سے پھل چوری کیا اسے بہ طور سزا کچھ کوڑے مارے جائیں گے اور اسے مسروقہ پھل کے وزن سے دوگنا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ اسی طرح جس شخص نے مویشی رات میں ان کی قیام گاہ پر پہنچنے سے پہلے چوری کیا، اس کو کچھ کوڑے مارے جائیں گے اور مویشی کی قیمت سے دوگنا تاوان ادا کرنا ہوگا۔ ایسا ہی فیصلہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے منقول ہے اور فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الحسبۃ: ص ۳۶)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت اور شرائط

امام ابن تیمیہؒ نے آگے ایک فصل 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے عنوان سے قائم کی ہے، جس میں انھوں نے قرآن وحدیث کی متعدد نصوص درج کرتے ہوئے اس کی فضیلت واہمیت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے، جس طرح جہاد فرض کفایہ ہے۔ اگر کچھ لوگ اسے انجام دیں تو باقی لوگوں سے وہ ساقط ہو جاتا ہے، ورنہ وہ فرض عین ہو جاتا ہے اور اسے ترک کرنے کی وجہ سے سارے لوگ گناہ گار ہوں گے۔ امام موصوف رقم طراز ہیں:

> **وکذلک الامر بالمعروف والنھی عن المنکر لا یجب علی کل أحد بعینہ بل ھو علی الکفایۃ کما دلّ علیہ القرآن، ولما کان لجھاد من تمام ذلک کان الجھاد ایضاً کذلک، فاذا لم یقم بہ من یقوم بواجبہ أثم کل قادر بحسب قدرتہ اذا ھو واجب علی کل انسان بحسب قدرتہ کما قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 'من رأی منکم منکراً فلیغّیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک أضعف الایمان** (الحسبۃ: ص ۴۰-۴۱)

> "ایسے ہی امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر فرد پر واجب نہیں ہے، بلکہ وہ فرض کفایہ ہے، جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، جس طرح جہاد فرض کفایہ

ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تتمہ ہے۔ پس جب اس کو ادا نہ کیا جائے تو اپنی قدرت و استطاعت کے مطابق ہر قادر شخص گناہ گار ہوگا، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ’جو شخص منکر دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روک دے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے اس کو برا جانے اور یہ سب سے کم درجے کا ایمان ہے‘‘۔

بسا اوقات بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم خود راہ راست پر ہیں تو دوسروں کی برائیاں ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لاَ يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُون (المائدۃ:۱۰۵)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گم راہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہ راست پر ہو‘‘۔

چنانچہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں، حالاں کہ حضرت ابوبکرؓ کے قول کے بموجب ایسے لوگ آیتِ مذکورہ کی غلط تأویل کرتے ہیں، بلکہ جیسا کہ انھوں نے حضور ﷺ سے سنا ہے: ’’لوگ برائی دیکھیں اور اس کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں تو عین ممکن ہے کہ عذاب یکساں طور پر سب کو گھیر لے‘‘۔

اس کے برعکس بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے اور موقع و محل دیکھے ہاتھ اور زبان سے اس کی انجام دہی کو ضروری سمجھتے ہیں، حالاں کہ اس کے لیے مصلحتوں اور موقع و محل دیکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے صلاح کے بہ جائے فساد رونما ہو جائے۔ اسی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے حکم رانوں کے ظلم و جبر پر صبر کی تلقین فرمائی ہے اور ان سے قتال کے خلاف خروج سے منع فرمایا ہے، جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ اہل السنۃ والجماعت کا یہی موقف ہے، جب کہ معتزلہ اور دوسرے فرقے حکم رانوں کے

خلاف خروج کو اصول دین میں سے قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس کی وجہ سے فساد برپا ہوتا ہے، حالاں کہ مفاسد و مصالح اور نیکی و برائی میں مصلحتوں وحکمتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ (الحسبۃ: ص ۴۲۔ ۴۳)

نیکی سے محبت اور برائی سے نفرت کبھی اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہوتی ہے اور کبھی اپنے نفس کے لیے۔ فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائی کے وقت دیکھنا چاہیے کہ اس کے پیچھے اصل محرک کیا ہے؟ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اتباع ہوئی یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی ہے، جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

يَدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (ص: ۲۶)

''اے داؤدؑ! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کے تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی''۔

حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ 'تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں: نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں: پوشیدہ وعلانیہ اللہ سے ڈرنا، محتاجی اور کشادگی میں میانہ روی اختیار کرنا اور غصہ ورضا میں کلمۂ حق بولنا۔ اور ہلاک کرنے والی چیزیں یہ ہیں: شح مطاع (یعنی ایسا بخل جو آدمی سے نہ جائے) ہوی نفس (یعنی نفس کی اندھی پیروی کرنا) اور عجب نفس (یعنی اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھنا)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اعمال صالحہ میں سے ہے اور کوئی عمل صالح بارگاہِ الٰہی میں اس وقت تک مقبول نہیں ہوتا جب تک کہ وہ محض اللہ کی رضا کے لیے نہ ہو اور اسے پورے علم اور بصیرت کے ساتھ انجام نہ دیا جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مشہور قول ہے:

من عبد اللہ بغیر علم کان ما یفسد اکثر مما یصلح (الحسبۃ: ص ۴۷)

''جس نے بغیر علم کی اللہ کی عبادت کی تو وہ جتنی اصلاح کرے گا اس سے کہیں زیادہ فساد برپا کرے گا''۔

چنانچہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لیے تین اوصاف کا ہونا ضروری ہے: علم، رفق اور صبر۔ علم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے پہلے ضروری ہے، رفق (نرمی) اس کی انجام دہی کے وقت اور صبر اسے انجام دینے کے بعد۔ بعض علماء سلف سے منقول ہے:

لا یأمر بالمعروف و ینهی عن المنکر الّامن کان فقیهاً فیما یأمر به فقیها فیما ینهی عنه، رفیقا فیما یأمر به رفیقاً فیما ینهی عنه، حلیماً یأمر به حلیماً فیما ینهی عنه۔ (الحسبۃ: ص ۴۸)

''کوئی شخص معروف کا حکم نہ دے اور منکر سے نہ روکے، مگر وہ اچھی طرح جانتا ہو کہ کس چیز کا حکم دے رہا ہے اور کس چیز سے روک رہا ہے۔ اسی طرح وہ معروف کا حکم دیتے ہوئے اور منکر سے روکتے ہوئے نرمی برتے۔ معروف کا حکم دیتے ہوئے اور منکر سے روکتے ہوئے وہ بردبار ہو''۔

یہ بات بھی جاننی چاہیے کہ بہت سے لوگ اپنے اندر ان صفات کو بہ درجۂ اتم نہیں پاتے تو سمجھتے ہیں کہ ان سے یہ فریضہ ساقط ہو گیا ہے، پھر وہ اس سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ترک واجب معصیت ہے۔ لہٰذا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی انجام دہی ہر حال میں کرنا ہے اور اس کے لیے مطلوبہ صفات بھی اپنے اندر پیدا کرنا ہے، ورنہ قوم اور سماج کو شر، مصیبت اور پریشانی لاحق ہوگی، جو آخرت میں ناکامی کا باعث ہوگی، لہٰذا اس سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ (الحسبۃ: ص ۴۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ

(الشوریٰ: ۳۰)

''تم لوگوں پر جو بھی مصیبت آئی، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی

ہے اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے''۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (السجدۃ:۲۱)

''اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اس دنیا میں کسی نہ کسی چھوٹے عذاب کا مزا انھیں چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ باز آجائیں''۔

قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ہیں، جن میں دنیا کی برائیوں، شر اور فساد کو آخرت کے عذاب اور شر کا باعث قرار دیا گیا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو انجام نہ دینا ہی دنیا میں شر و فساد کا باعث ہے، جس کا خاتمہ عذاب آخرت پر ہوگا۔

اسلام کی دعوت

مولانا سید جلال الدین عمری

رسول کی تعریف اور اس کی ذمہ داریاں، حضرت محمد مصطفی ﷺ کا عظیم کارنامۂ دعوت، مباحثِ دعوت، دعوت اور اتباع، دعوت و اصلاح کی ترتیب، دعوت کے اصول و آداب، انکار دین کے اسباب، دعوت کے لیے ضروری اوصاف (ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ، نماز، زکوۃ، اخلاص اور استقامت) دعوت اور تنظیم، اور تنظیم کیسے مستحکم ہوتی ہے؟ جیسے اہم اور ٹھوس موضوعات پر خالص داعیانہ گفتگو۔ کتاب کے مطالعے سے قاری پر دعوت و تبلیغ کا تصور واضح ہوگا اور اسے اپنے اندر کارِ دعوت کے لیے جذبہ و حرارت کا بھی احساس ہوگا۔ فاضل مصنف کی نظر ثانی اور ضروری حذف و اضافہ کے بعد تازہ اور دلکش ایڈیشن۔

صفحات: ۳۴۴ قیمت: ۲۰۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ۔ ۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، D-307، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵

امیر خسرو کی تصنیف 'خزائن الفتوح'
ثقافتی ومعاشرتی مطالعہ

—————— ڈاکٹر محمد امین عامر

حضرت امیر خسروؒ (۶۵۱ھ/ ۱۲۵۳ء تا ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ئ) ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان سے قبل اور بعد میں بھی فارسی کے بہت سے شعراء و ادباء گزرے ہیں، لیکن ہندوستان کے فارسی شعراء میں امیر خسروؒ کا جو مقام و مرتبہ ہے، وہ آج تک کسی ہندوستانی شاعر کو حاصل نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ فارسی زبان و ادب میں ان کی عظمت کو ایران کے بڑے بڑے شعراء نے بھی تسلیم کیا ہے۔

امیر خسرو کی نثری تصنیف 'خزائن الفتوح' [۱] میں سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات اور نظمِ حکومت کے حالات و واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، لیکن ان سے صرف نظر کرتے ہوئے اس مقالے میں کتاب میں درج صرف ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

کتاب کے آغاز میں اللہ کی حمد و ثنا اور بارگاہ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> **الحمد للفتاح الذی فتح خزائن الفتوح علی دین محمد و أعز جمع أنصاره بنصر مؤید عزّ شأنه وعلی سلطانه و الصلاة علی نبی ۔۔۔۔و لقدنصر کم اللہ ببدر"(ص ۱)**
>
> جس طرح اللہ نے اپنے نبی کو جنگِ بدر میں کامیابی عطا فرمائی اور اس کے بعد سے ان کے لیے فتوحات کے دروازے وا کر دیے بعینہ اس کتاب کو 'خزائن الفتوح' کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، کیوں کہ اس میں سلطان

علاء الدین کی فتوحات درج ہیں۔

اس کے بعد مصنف کتاب کا سبب تألیف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''رقم سنج مدایح شہنشاہی علائی بندہ خسرو کہ قلمس ہر چند پابند کند و تمامی عرصۂ سیاہی و پیدی را دست بدست و انگشت بہ انگشت بہ پیمایۂ از اول پایۂ محامد ایں شاہ درنتواند گذشت۔۔۔الخ'' (ص، ۲۔۳)

شہنشاہ علاء الدین کی تعریف وتوصیف اور اس کے حکومتی کارناموں سے متعلق میں نے قلم اٹھایا۔ چناں چہ جو کچھ میں نے مشاہدہ کیا اسے من وعن بیان کر دیا ہے۔

اس کے بعد خسرو لکھتے ہیں:

''کتاب کا بخطاب خزاین الفتوح تذہیب یافتہ است از فتح دیوگیر۔۔تا ارنگل۔۔قلم از صد معانی یکی در بیان آرم'' (ص۔۵)

اس کتاب 'خزائن الفتوح' میں، میں نے دیوگیر سے ارنگل تک کے سو(۱۰۰) فتوحات کا ذکر کر دیا ہے۔

'تاریخ علائی' پر مشتمل اس کتاب میں ۶۹۵ھ سے لے کر ۷۱۱ھ تک یعنی کل سولہ (۱۶) سال کے فتوحات اور واقعات درج ہیں۔ کتاب کا اختتام خسرو اس عبارت پر کرتے ہیں:

''بفضل خالق قلم ایں فتحنامہ کہ مثالی است از دیوان انشای خسروی موشح بطغرای ابوالمظفر محمد شاہ السلطان اختتام یافت''۔(ص ۱۷۰)

'خدا کے فضل و کرم سے، جس نے خسرو کو قلم عنایت کیا، یہ فتح نامہ یعنی 'خزائن الفتوح' (جو میرے اپنے دیوان کے مقابلے میں مثالی ہے) ابو المظفر محمد شاہ سلطان کے بیان پر ختم ہوا'۔

عوامی اصلاحات اور رفاہی امور پر ایک نظر

حکومت خواہ کسی کی بھی ہو، عوام اصلاحات اور رفاہی امور کے سایے میں سکون و

عافیت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔عہدِ علائی میں ان امور کی جانب جو توجہ مبذول کی گئی، خسرو نے اسے بیان کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھا، تا کہ آئندہ ہر حکومت انہی بنیادوں پر استوار ہو سکے اور عوام کو اعتماد میں لے کر حکم رانی کی جا سکے۔عوامی اور معاشرتی سکون و چین سے حکومت بھی عافیت محسوس کرتی ہے اور اسے یک گونہ اپنی کام یاب حکم رانی کا احساس ہوتا ہے۔

عوامی اصلاحات اور رفاہی امور سے متعلق خسرو لکھتے ہیں:

''دو شنبہ وز مہ حج دور وزہ بیست تاریخ سال ششسد و پنج و نودھمان دریں تاریخ ایں اولوالامر ندای اطیعوا مری از شرق تا غرب درداد''۔(ص ۱۲)

'بروز سوموار، ۲/ذی الحجہ ۶۹۵ھ کو تخت سلطنت پر تسلط پانے کے بعد سلطان نے پورے ملک میں مشرق سے مغرب تک اپنی حکم رانی کا اعلان کروادیا'۔

اس کے بعد خسرو کا یہ بیان ہے:

''اول آنکہ از شرق تا غرب و جنوب تا شمال مما کب چندیں بار خراج رعایا بہ بخشد و دیگر زرھای کہ رایان ہند از دور مہراج و بکرماجیت گرد آوردہ بودند ۔۔۔وبیت المال رابمچا بہ مالا مال گرداند۔۔۔ و بہ میزان سنیسلہ زرمی بخشد تا ہر کہ صفر است حوت دار غرق تنکۂ سیم و زرفی شود۔'' (ص ۱۴)

رعایا کی راحت رسانی کے لیے علاء الدین نے سب سے پہلے لائق تحسین اور قابلِ قدر اقدامات کیے۔وہ یہ تھے کہ اس نے اپنی بے انتہا جود و سخاوت اور فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رعایا پر لگایا گیا زمین کا ٹیکس بالکل معاف کر دیا۔مزید ان پر یہ احسان و کرم کیا کہ مہراج اور بکرماجیت کے زمانے کی ہاتھ آئی ہوئی دولت مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی غریب رعایا میں تقسیم کروا دی، تا کہ ملک کا کوئی فرد، دست نگر اور محتاج نہ رہے، یہاں تک کہ جنگی مہم کے دوران جو مالِ غنیمت ہاتھ لگا اس کو علاء

الدین نے غرباء ومساکین میں خیرات کروادیا۔

خسرو مزید رقم طراز ہیں :

'باز برای وسعت معاش عامہ خلق محترفۂ گران فروش را از بارخریدن بسک گردانید ورئیسی راست کار برسر ایشان گماشت کہ بابازگانا زبان آور بزبان درۂ عدل سخن گوید وبی زبانانرا زبان دہد۔۔۔علی العموم بہ برآہن بلکہ بر دلہای آہنی ایشان نشست۔'' (ص۱۶)

رفاہی امور سے متعلق علاء الدین کا قابلِ قدر کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے عام پبلک کے لیے وسائلِ روزگار کے حصول میں آسانیاں مہیا کیں، جس کی وجہ سے ہر شخص آسودہ حال اور خوش حال ہو گیا۔ نیز دوکان داروں کے ٹیکس میں کمی کردی، تاکہ وہ مہنگے داموں سامان فروخت کرنے سے باز رہیں اور ان کی نگہبانی پر ایمان دار افسروں کو مقرر کیا، تاکہ کوئی بھی دوکان دار گاہکوں کے ساتھ سخت زبانی نہ کرے اور ان کے ساتھ خرید و فروخت کے معاملے میں بے ایمانی کا رویہ نہ اپنائے۔ اگر کوئی دوکاندار ڈنڈی مارتا ہوا پکڑا جاتا تو اسے سخت سزا دی جاتی۔ اسی طرح عہدِ علائی میں عدل و انصاف کا ایک مستقل نظام قائم کیا گیا تھا اور کوئی شخص بھی اس کے قائم کردہ نظام عدل وقسط میں خلل ڈالنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اس کے دور میں امن وسکون کا ایسا ماحول قائم تھا کہ شیر اور بکری ایک ساتھ ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے اور ہرن کے بچے بے خوف وخطر شیروں کی موجودگی میں چوکڑیاں بھرا کرتے تھے۔ غرض کہ ہر طرح کے مجرموں اور ظالموں سے ملک کو پاک کردیا گیا تھا اور امن وامان کی فضا میں ہر شخص کو چین کی بانسری بجانے کی آزادی تھی۔ (ص ۱۷ تا ۱۹)

عصر حاضر کی ہندوستانی سیاست، معیشت، تجارت اور امن وامان کی کیفیت کا آج سے تقریباً آٹھ سو (۸۰۰) سال پہلے کی مسلم حکومت سے موازنہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ عہد کتنا ترقی یافتہ اور متمدن تھا، جب کہ آج فقط جمہوریت اور سیکولرزم کے فلک شگاف نعروں اور قومی فلاح و بہبود کے بلند بانگ دعوؤں نے مکار اور منافق لیڈروں

اور حکم رانوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ہر کوئی اپنی تن آسانی میں محو ہے اور غریب رعایا کا حال بد سے بدتر ہے۔ گھوٹالے پر گھوٹالے ہو رہے ہیں اور ملکی نظام درہم برہم ہے۔ ان حالات میں عہد علائی کی خوش آیند تصویر کشی ہم ہندوستانیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

علاء الدین نے ملک کو پاکیزہ اور صالح معاشرہ بھی عطا کیا تھا۔ وہ خود بھی نیک طبیعت، پابند شریعت اور پاکیزہ اخلاق و کردار کا حامل انسان تھا۔ اس نے ہر طرح کی فحاشی فسق و فجور اور برائیوں کو دور کرنے کی خاطر جو اقدامات کیے اس پر خسرو قلم طراز ہیں:

''شریعت خاصۂ آن ذات مطہر است وآنر کہ ام الخبائث است ونبت الکروم وہمشیرۂ نیشکر باجملگی آن کار از مجلس فساد بیر دۂ صلاح آوردہ۔۔۔ شاہدان کہ زلف در بنا گوش نشان دہ برای فساد زنجیر فی بریدند و پای کشادہ فی گشتند ہمہ بعقد حبالہ پای بند گشتہ۔۔۔ وآنکہ در ایام فساد ریشۂ دانی ایشان بجای کشیدہ کہ در پردۂ ستر بہنگام تافتن ریشۂ دامنی بند امت تمام دست بردست فی مالند، فی الجملہ ہر چہ مادۂ فسق و فجور بود ہمہ منقطع گشت۔''

(ص۔ ۱۷۔۱۹)

شراب کی خرید و فروخت اور اس کے استعمال پر پابندی، تمام فحش اور معاصی امور کے اڈوں کو بند کرنا، طوائفوں اور ہیجڑوں کو ان کے ناجائز اور آبرو باختہ پیشوں سے نجات دلا کر انہیں شادی کے بندھن میں باندھنا اور تحفظ عزت فراہم کرنا، نیز چوروں، بدمعاشوں، لٹیروں اور ڈاکوؤں سے معاشرہ کو پاک کرنا، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور ہم جنس پرستی پر قدغن لگانا اور اسی طرح کے دیگر بے حیائی، بے شرمی اور اباحیت پسندی کے کاموں سے علاء الدین نے سماج کو بالکل پاک کر دیا تھا، تاکہ عوام ہر طرح کے شر و فساد سے دور رہ کر امن و سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔

آج کے جمہوری اور خدا بیزار نظامِ حیات میں کون سی ایسی برائی نہیں ہے جو

سر چڑھ کر نہ بول رہی ہے۔سرکاری لائسنس پر شراب کی خرید و فروخت عام ہے،سٹہ اور جوا کا کاروبار پھیلا ہوا ہے، بے حیائی کے اڈے اور قحبہ خانے عروج پر ہیں،ہم جنس پرستی قانون کا درجہ پا چکی ہے،عورتوں کی عصمتیں دن رات تاتار ہو رہی ہیں اور ہندوستانی معاشرہ اخلاقی انحطاط کی دلدل میں گرتا چلا جا رہا ہے ۔ کسے فکر ہے کہ اخلاقی اقدار کی پامالیوں پر پابندی عائد کرے، جب کہ قومی لیڈران خود ان میں گرفتار ہیں۔

آگے خسرو نے عہد علائی کی تہذیب و تمدن کا بھی تذکرہ کیا ہے، جو مساجد اور دیگر تعمیرات کے ضمن میں مشاہدہ میں آتی ہیں، مثلاً مقصورہ میں شاہی مسجد کی تعمیر، جس کی مشابہت مکہ مکرمہ سے تھی اور جو پتھروں کے ڈھانچے پر تعمیر کی گئی تھی اور اس پر کندہ قرآنی آیتیں فنکاری اور زیب و زینت کی عمدہ مثالیں پیش کر رہی تھیں۔اس کے علاوہ مسجد کے اندر اور باہر خوب صورت پلاسٹر سے مسجد کا حسن دوبالا ہو رہا تھا۔ یہ مسجد عہد علائی کے ہندوستانی سنگ تراشوں اور صنعت کاروں کے فن کا لاجواب مظاہرہ پیش کر رہی تھی۔اس کے علاوہ دیگر مساجد کی تعمیر بھی اسی طرز سے ہوئی۔مساجد کی تعمیر اور مرمت کے بعد شہر کی مضبوط فصیل تعمیر کی گئی، جو دنیا میں دوسری سدّ سکندری سے کم نہیں تھی۔(ص ۲۳۔۲۹)

علاء الدین خلجی نے ایک حوض بھی تعمیر کروایا تھا جو 'حوضِ شمسی' کہلاتا تھا۔ اس کی تعریف و توصیف میں امیر خسرو رقم طراز ہیں:

> ''حوض سلطان کہ باسم شمسی چون چشمۂ خورشید تا صبح قیامت روشن خوہد بود ،ہر روز آفتاب اور آئینہ روی خویش می ساخت واوعلی العکس صورت حال شمس خودرا توجیہ می کرد، اگر چہ آفتاب بروتافتہ می شد امّا حوض برای تعظیم شمس فرورفتہ اندک اندک آب فرود میخواد۔'' (ص۔۳۰)

سلطان کا یہ حوض 'حوضِ شمسی' کے نام سے موسوم تھا۔اس کی ہیئت و خصوصیت یہ تھی کہ سورج ہی کی طرح صبح قیامت تک یہ حوض قائم و دائم رہے گا روزانہ صبح کو جب سورج کی شعائیں اس پر پڑتی تھیں تو سورج خود ہی اپنا حالِ تاب بیان کرنے لگتا تھا، حالاں کہ سورج کے تاب و تواں سے حوض کا پانی تعظیماً نیچے چلا جاتا تھا اور تھوڑا تھوڑا سطح آب پر مانند بلبلہ نمودار ہوتا تھا۔

حوض کا پانی اس قدر مثل آئینہ صاف و شفاف اور نظیف ہوا کرتا تھا کہ نیلگوں آسمان کا عکس اور ستارے و سیارے کے چہرے اس میں صاف جھلکتے تھے۔ گرمیوں میں اس کا پانی خشک اور موسم باراں میں جل تھل ہو جایا کرتا تھا۔ شہر دہلی میں یہ حوض مصر کے دریائے نیل اور دجلہ سے کم نہ تھا کہ جس سے پوری خلقت سیراب ہوتی تھی۔

الغرض امیر خسروؒ کی یہ تصنیف جس کا بالاختصار معاشرتی و ثقافتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا مفصل جائزہ لینے اور مطالعہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے حالات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات، ان کی بد اعتقادیوں اور بداعمالیوں کی تفصیلات اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں اور تنبیہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب کے اس مفصل تذکرہ کا مقصد کیا ہے؟ اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت و نصیحت کے کون سے پہلو ہیں؟ اور اس سے انہیں کیا رہ نمائی ملتی ہے؟ اس کتاب میں ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری کا مسبوط اور دقیق مقدّمہ بھی ہے۔

عمدہ کاغذ، آفسیٹ کی حسین طباعت، دیدہ زیب سرورق، صفحات: ۲۹۶ قیمت =/۱۷۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ۔ ۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، D-307، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵

دو نئی مطبوعات

۱– توحید اور قیام عدل　　مولانا محمد جرجیس کریمی

توحید کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس پر ایمان لانے سے انسانی زندگی میں نظم، توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے اور اس پر ایمان نہ لانے سے وہ بدنظمی، بے اعتدالی اور فساد کا شکار ہوجاتی ہے۔ یہ کتاب چار مباحث پر مشتمل ہے۔ ان میں عقیدۂ توحید کی وضاحت، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اعتدال و توازن کے اثرات نیز عقیدۂ توحید سے محرومی اور شرک و الحاد میں آلودگی کے نقصانات اور افکار و خیال پر پڑنے والے اثرات کا عالمانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ صفحات: ۹۲، قیمت:–/۵۰ روپے

۲– اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت　ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

زمانۂ نزول قرآن میں یہودیت اور عیسائیت دو بڑے مذاہب تھے۔ قرآن نے ان کے ماننے والوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور ان کی تحریفات اور انحرافات کی نشان دہی کرتے ہوئے واضح کیا کہ اسلام ہی اللہ کا اصل دین ہے، جسے لے کر ہر پیغمبر آیا تھا اور جس کے ساتھ اب آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ بھیجے گئے ہیں۔

اس کتاب میں ان بنیادی نکات کو نمایاں کیا گیا ہے جنھیں راہِ دعوت میں کام کرنے والوں کو دیگر اہل مذاہب سے گفتگو کرتے ہوئے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے ہوئے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس مطالعہ میں قرآن کریم کو بنیاد بنایا گیا ہے اور قدیم و جدید کتبِ تفسیر سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ صفحات: ۸۴، قیمت:–/۵ ۴ روپے

–: ملنے کے پتے :–

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر – ۹۳ علی گڑھ – ۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی – ۲۵

بحث ونظر

اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ

اسلام کا نقطۂ نظر

مولانا محمد قمر الزماں ندوی

انسانی زندگی کی سلامتی وحفاظت کو اسلام نے بڑی اہمیت دی ہے۔اس کے لیے شریعت میں خصوصی ہدایات واحکام ہیں۔ اسلام نے اپنے ماننے والے کے لیے ان چیزوں سے اجتناب اور پرہیز لازم قرار دیا ہے جو انسانی زندگی کے تحفظ میں رکاوٹ اور مانع بنتی ہیں اوران سے ہلاکت وبربادی کا خطرہ رہتا ہے۔

اسلام اس سلسلے میں بہت حساس واقع ہوا ہے۔چنانچہ اس نے انسانی جان کی حفاظت کے لیے حالتِ اضطرار میں حرام اشیاء کو کھانے اور پینے کی اجازت دی ہے۔حیاتِ انسانی کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ علاج معالجہ بھی ہے۔ خوداللہ کے رسول ﷺ نے علاج کرانے کی ترغیب دی ہے۔آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جیسے بیماریاں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے پیدا ہوئی ہیں، اسی طرح دوائیں بھی اس کے حکم سے وجود میں آئی ہیں، لہٰذا جب بیمار ہوجاؤ تو دوا کا استعمال کرو۔ احادیث نبویہ سے یہ بات بالکل ثابت ہے کہ خود آپؐ نے خود بھی اپنا علاج کرایا ہے۔کتب حدیث میں طب نبویؐ کا ایک مستقل باب ہے۔

میدانِ طب میں حیرت انگیز ترقیاں

عہد رفتہ میں عام طور پر نباتات اور جمادات سے علاج کیا جاتا تھا۔بعض دوائیں زمینی اجزاء سے حاصل کی جاتی تھیں، جیسے چونا، لوہا، سونا چاندی وغیرہ اور نباتات تو بے شمار ہیں جن کا دوا کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔آج بھی بیش تر دوائیں نباتات سے حاصل کی جاتی ہیں۔

لیکن انسانی زندگی ہر دم رواں دواں ہے۔ ہر نیا زمانہ اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آتا ہے، خاص طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں مشین کی ایجاد کے بعد حالات نے جو پلٹا کھایا ہے، اس سے زندگی کا کوئی گوشہ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ہے۔ اس نے زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں اور ہر علم و فن میں نئے مسائل پیدا کر کے تحقیق و تفتیش کے نئے میدان کھولے ہیں۔ میدانِ طب و جراحت میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں، جن کے نتیجے میں ایسے بے شمار فقہی مسائل پیدا ہوئے ہیں جن کا صریح حکم قرآن و حدیث یا فقہ میں موجود نہیں ہے۔ ان کا حکم جاننے کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

طب و جراحت کی موجودہ ترقیات نے معالجات میں جو بہت سی نئی صورتیں پیدا کر دی ہیں، ان سے جہاں طبی فوائد حاصل ہوئے ہیں، وہیں بہت سے شرعی مسائل حلال و حرام کے متعلق بھی پیدا ہو گئے ہیں، مثلاً ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا، ایک کی کھال دوسرے کے بدن پر جمانا، ایک شخص کی آنکھ، ناک، گردہ وغیرہ دوسرے کے جسم میں منتقل کرنا، وغیرہ۔

تمام مسائل کا حل شریعت میں موجود ہے

موجودہ سائنسی ترقی سے پہلے انسانی اجزاء سے علاج کا تذکرہ ایک دو صورتوں کو چھوڑ کر نہیں ملتا، جیسے کتب فقہ میں عورت کے دودھ کو کان کے درد میں دوا کے طور پر استعمال کرنے کا ذکر پایا جاتا ہے، لیکن انسانی اعضاء اور دوسرے اجزاء کے ذریعہ علاج کا تذکرہ نہیں ملتا۔ انسانی اجزاء میں سے ایک شخص کا خون دوسرے شخص کو چڑھانے کی فقہاء نے ضرورت پڑنے پر اجازت دی ہے، لیکن کیا ایک شخص کے عضو کی دوسرے شخص کے جسم میں پیوندکاری کی جاسکتی ہے؟ یا کیا کوئی شخص اپنے جسم کا کوئی عضو دوسرے کو ہبہ کرسکتا ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جس کا جواب براہ راست قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے، لیکن اسلامی شریعت اسلامیہ کا کمال یہ ہے کہ ان کے بتائے ہوئے اصول اور قواعد

میں صحیح غور وفکر سے کام لیا جائے تو ہر نئے سوال اور نئی صورت کا جواب اس میں مل جائے گا؟ شرط یہ ہے کہ قرآن وسنت کے علوم کو اسلاف کی تشریح وتوضیح کی روشنی میں سمجھا جائے اورخوف خدااور آخرت کی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ شرعی حدود کے اندرضرورتوں کی تکمیل پیش نظر ہو،محض وقتی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے قرآن وسنت کی نصوص میں کھینچ تان اور بے جا تاویلات نہ کی جائیں۔

چند اصولی مباحث

مذکورہ موضوع چوں کہ انتہائی حساس ہے،اس لیے اس سے متعلق سوالات کے جوابات سے پہلے چند اصولی باتیں سمجھ لینا ضروری ہے،تاکہ آنے والے مسائل اور ان کے جوابات کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

(الف)ہرحرام چیزبنی نوع انسان کے لیے مضر ہے

پہلی اصولی بات یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے جن چیزوں کوحرام وممنوع قرار دیا ہے اور ان کی حرمت کا باقاعدہ اعلان واظہار کر دیا ہے، وہ تمام انسانوں کے مفاد کی خاطر اور بڑی حکمت ومصلحت پر مبنی ہیں۔حق تعالیٰ علیم وخبیر ہے،اس کا ہر کام حکمت سے پر ہے،اس کا کوئی حکم فضول وبے فائدہ نہیں ہوسکتا۔

اس لیے ایمان والوں کو یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ جن چیزوں کواللہ کی جانب سے ہم پرحرام کیا گیا ہے، وہ انسانیت کے لیے ضرر رساں ہیں۔اگران میں کوئی نفع محسوس بھی ہوتو مضرت کا پہلو بہرحال غالب ہوگا۔ان میں سے بعض مضرتیں تو ایسی ہوتی ہیں جوانسانی جسم کو بیمار یا کم زور کر دیتی ہیں اور بعض وہ ہیں جن سے جسم کو ظاہری طور پر تو کوئی نقصان لاحق نہیں ہوتا،مگر وہ روح انسانی کے لیے مضر ہوتی ہیں اور انسانی اخلاق وکردار پر ان کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔

(ب)انسانی تکریم وتعظیم

دوسری اصولی چیز یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک نے زمین وآسمان کی تمام مخلوقات

میں انسان کو تکریم و تعظیم اور فضیلت و شرف کے اعلیٰ معیار پر فائز فرمایا ہے اور ظاہری اور معنوی ہر دو حیثیت سے اس کو تمام کائنات میں اعلیٰ اور ممتاز درجہ دیا ہے۔ تکریم انسانی کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ اولاد آدم کو زندگی اور آسودگی کی خاطر کائنات کی تمام مخلوقات سے اپنی خدمت اور کام لینے کا حق دیا گیا۔ غور کیجئے، بہت سے جانوروں کے دودھ سے لے کر گوشت اور ہڈی وغیرہ سب چیزیں انسان کے لیے مباح کر دی گئیں کہ وہ ان کو اپنی ضرورت میں استعمال کریں، انسانی جان کی حفاظت کے لیے احکام و مسائل میں طرح طرح کی آسانیاں پیدا کی گئیں اور انسان کو یہ باور کرایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، زحمت اور پریشانی نہیں چاہتا اور خاص اضطراری صورتوں اور حالتوں میں انسانی جان کی حفاظت کے لیے بہت سی حرام چیزوں میں گنجائش دی گئی۔ تکریم انسانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنی خوراک اور علاج و دوا کے لیے بے شمار چیزوں کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر اپنے کام لا سکتا ہے، مگر کسی انسان کے جز اور عضو کے ساتھ یہ معاملہ جائز نہیں، کیوں کہ یہ تکریم انسان کے خلاف ہے۔ اس کے اجزاء کا لین دین، بیع و شراء تمام اشیاء کی طرح جائز نہیں۔ علاج و دوا کے معاملے میں شریعت اسلامی کے تمام احکام ان ہی دونوں پہلوؤں کی رعایت پر دائر ہیں۔ [۱]

(ج) جسم انسانی اللہ کی امانت ہے

تیسری اصولی بات یہ ہے کہ جسم انسانی اللہ تعالیٰ کی مقدس امانت ہے، انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ انسانی حرمت و کرامت کا تقاضا اور خدائی امانت کا لحاظ اسی میں ہے کہ انسان کسی بھی صورت میں اپنی جان و جسم کو ضائع و برباد نہیں کرسکتا اور نہ کسی انسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ ناحق کسی انسانی جان کو ضائع اور برباد کرے۔ اسی لیے اکثر فقہاء نے انسانی اجزاء و اعضاء سے انتفاع کو بھی حرام قرار دیا ہے کہ کہیں انسان متاع خرید و فروخت بن جائے۔ یہ اس کی شانِ تکریم کے خلاف ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حرمت و کرامت میں زندہ اور مردہ دونوں مساوی ہیں۔ اس لیے نہ زندہ انسان کے اعضاء اس مقصد کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں نہ مردہ

کے۔اس سلسلے میں صراحت اس حدیث میں ملتی ہے: ''**کسر عظم المیت ککسر عظم الحی**''مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندگی میں اس شخص کی ہڈی توڑنا''۔ ۲؎

چند فقہی اصطلاحات

اہل مغرب کی طرف سے دباؤ اور میدان طب میں ان کی حیرت انگیز ترقی سے متأثر ہو کر آج عوام الناس، بلکہ خواص کا بڑا طبقہ یورپ کی ہر طرح کی طبی سہولیات سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے، چاہے وہ شریعت اسلامی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔آج ہر انسان حاجت کو ضرورت کا درجہ اور اضطرار کا مقام دے رہا ہے، حالاں کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔علامہ حمودیؒ نے احتیاجات کے پانچ درجے قرار دیے ہیں:

(۱) ضرورت:

ضرورت کی تعریف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک یا قریب الموت ہوجائے گا۔اسی کو اضطرار کہتے ہیں۔اس حالت میں حرام وممنوع چیز کا استعمال چند شرائط کے ساتھ جائز ہوجاتا ہے۔

(۲) حاجت:

حاجت کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہیں ہوگا، مگر اسے مشقت اور تکلیف شدید ہوگی۔ یہ صورت اضطرار کی نہیں ہے۔اس لیے اس کے واسطے روزہ، نماز، طہارت وغیرہ کے بہت سے احکام میں رعایت اور سہولت تو دی گئی ہے، مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوں گی۔

(۳) منفعت:

منفعت یہ ہے کہ کسی چیز کے استعمال کرنے سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا، لیکن نہ کرنے سے کوئی سخت تکلیف یا ہلاکت کا خطرہ نہیں ہے، جیسے عمدہ قسم کے کھانے اور مقوی غذائیں۔اس حالت کے لیے نہ کوئی حرام حلال ہوسکتا ہے، نہ روزہ ترک کرنے کی اجازت ہے۔اگر کسی شخص کو مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہوسکیں تو وہ ان

کا استعمال کرے اور نہ حاصل ہوسکیں تو صبر کرے۔

(۴) زینت:

زینت وہ چیز ہے، جس سے بدن کو کوئی خاص تقویت حاصل نہ ہو، بلکہ آدمہ اس کا استعمال، محض تفریح اور خواہش کے طور پر کرے۔ ظاہر ہے، اس کام کے لیے کسی ناجائز چیز کو جائز کیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۵) فضول:

فضول سے مراد وہ چیز ہے جو زینت کے دائرہ سے بھی آگے، محض ہوس ہو۔ اس کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کے لیے احکام میں کوئی رعایت نہیں دی گئی، بلکہ اس کی مخالفت احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔ ۳؎

ایک قوی اندیشہ

انسانی اعضاء کو قطع و برید کرکے استعمال کرنا انسانی شرافت وتکریم اور مبدأ تخلیق کائنات کے بالکل منافی ہے۔ دنیا کے ہر دور میں عقلاء وحکماء نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا ہے کہ انسانی اعضاء کی خرید و فروخت اور انھیں کاٹ تراش کر استعمال کرنا سنگین جرم اور سخت ناپسندیدہ ہے، انسانیت کے ساتھ مذاق اور اس کی توہین وتذلیل ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی مختلف شریعتوں کا بھی اس پر اتفاق رہا ہے۔ اس لیے انسان کے عضو کا بدل جمادات یا نباتات وغیرہ سے تلاش کیا جائے اور فنی مہارت کے ذریعہ اس کو کارآمد اور مفید بنایا جائے، جیسے مصنوعی دانت، مصنوعی آلۂ سماعت، پیس میکر وغیرہ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حیوانات کے اعضاء سے یہ کام لیا جائے۔ یہ بھی قدیم زمانہ سے مروج ہے اور موجودہ طبی تحقیقات اور سرجری کی ترقیات نے اس فن میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرلی ہے۔ اگر اس فن پر اس کے ماہرین اپنی پوری توجہ مبذول کردیں تو بعید نہیں کہ مزید راہیں کھلیں اور زیادہ سے زیادہ مفید اور کام یاب علاج کی صورتیں نکلیں۔

یہ دونوں صورتیں تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہیں اور دینی و دنیوی، شخصی و

اجتماعی ہر لحاظ سے بے ضرر ہیں، جب کہ تیسری صورت، یعنی انسانی اعضاء سے دوسرے انسانوں کا علاج اور ان کے لیے اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ، اس میں اگر چہ ظاہری اعتبار سے بہت سے فائدے ہیں، جن کا آج مشاہدہ کیا جا رہا ہے،لیکن اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو یہ صورت پوری انسانیت کے لیے تباہی کاپیش خیمہ بن سکتی ہے ۔اس سلسلے میں مفتی محمد شفیعؒ نے متنبہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انسان کوجس طرح خودکشی کرنا حرام ہے اسی طرح اپنا کوئی عضوکسی دوسرے کو رضا کارانہ طور پر بلا معاوضہ دے دینا بھی حرام ہے۔ فقہاء نے قرآن وسنت کی واضح نصوص کی بنا پر فرمایا ہے کہ جوشخص بھوک پیاس سے مر رہا ہواس کے لیے مردار جانور اور ناجائز چیزوں کا کھانا پینا تو بقدرِضرورت جائز ہوجاتا ہے ،مگر یہ بات اس وقت بھی جائز نہیں ہوتی کہ کسی دوسرے زندہ انسان کا گوشت کھالے اور نہ کسی انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا گوشت یا کوئی عضو دوسرے انسان کو بخشش کر دے، کیوں کہ خرید وفروخت یا بخشش و ہدیہ اپنی مِلک میں ہوسکتا ہے، روح انسانی اور اعضاء انسانی اس کی مِلک نہیں، جو وہ کسی کو دے سکے''۔

آج کل ڈاکٹری اور سرجری کی نئی ترقیات نے فنی طور پر بلا شبہ اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے کہ ایک انسان کی آنکھیں دوسرے نابینا انسان کے چہرہ میں پیوست کرکے اس کو بینا کر دکھایا، ایک انسان کا گردہ، پتہ، پھیپھڑا دوسرے مریض انسان کے جسم میں لگا کر اس کوتندرست کر دینے کا کرشمہ دکھایا۔ اس وقت یہ کام جس انداز اور پیمانے پر ہورہا ہے اس میں بہ ظاہر ان مضرتوں کی روک تھام کا انتظام کرلیا گیا ہے جواس تماشے کے نتیجہ میں پورے انسانی معاشرے کو تباہی میں ڈال سکتی ہے، کیوں کہ ایسے اعضاء صرف خالص رضا کارانہ طور پر صرف ان لوگوں سے لیے اور دیے جاتے ہیں جو اس جہان سے گذر رہے ہیں، خواہ کسی بیماری کی وجہ سے یا سزا کے طور پر قتل ہونے کی

وجہ سے،لیکن دنیا کے تجربات رکھنے والا کوئی صاحب بصیرت ان وقتی پابندیوں پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ خدانخواستہ یہ طریق علاج رواج پا گیا تو اس کا ایک نقد نتیجہ تو یہ ہوگا کہ غریب انسان کی آنکھیں اور گردے اور دوسرے اعضاء ایک بکاؤ مال کی طرح بازار میں بکا کریں گے۔ وہ اپنے بچوں کی خاطر یہ قربانی اپنی رضامندی کے ساتھ دے گا۔۔۔۔اگر یہ چیزیں بھی بکاؤ مال بن گئیں تو بہت سے غریب اپنے بچوں کی مصیبت دور کرنے کے لیے اپنی یہ چیزیں بھی داؤ پر لگا دیں گے اور دنیا کا تجربہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ پھر یہ بگاڑ صرف یہیں نہیں رکے گا کہ رضاکارانہ طور کسی انسان کے اعضاء و اجزاء لیے جائیں، بلکہ بہت سے مردے خصوصاً لاوارث مردے بہت سے اعضاء سے محروم ہوکر اس دنیا سے جایا کریں گے اور شاید اگلے دور کے حکماء انسانی اعضاء کو دیر تک کارآمد باقی رکھنے کا کوئی انتظام کرلیں، جیسے آج کل انسانی خون بلڈ بنکوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے تو پھر کسی انسانی میت کی خیر نہیں اور یہ غسل، نماز جنازہ اور کفن ودفن کے سارے قصے ہی بے باق ہوجائیں''۔ ۵؎

اسلامک فقہ اکیڈمی کے سوالات

اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کی جانب سے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔ ذیل میں ان کے جوابات پیش کیے جارہے ہیں:

خون کا عطیہ:

سوال نمبر (۱) کیا ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو ضرورت پڑنی پر خون کا عطیہ دے سکتا ہے؟

ضرورت پڑنے پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو بھی خون کا عطیہ دے سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر اکثر علماء اور اہل افتاء کا اتفاق ہو چکا ہے۔ عصرِ حاضر میں یہ ایک عظیم انسانی خدمت ہے۔ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لیے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت پیش نہیں

آتی، بلکہ انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے بدن میں ڈالا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے اس کی مثال انسانی دودھ کی سی ہے جو بدن انسانی سے بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے نکلتا ہے اور دوسرے انسان کے بدن کا جزء بنتا ہے۔ شریعت اسلامی نے بچے کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ کو اس کی غذا قرار دیا ہے اور ماں کے لیے بچوں کو دودھ پلانا صرف جائز نہیں، بلکہ عام حالات میں واجب قرار دیا گیا ہے۔ بچوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی دوا وعلاج کے طور پر عورت کے دودھ کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

''ولا بأس بأن یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشرب به للدواء''[٦]

'اس میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی دوا کے طور پر عورت کا دودھ اپنی ناک میں ڈالے یا پیے'۔

اس لیے جزء انسانی ہونے کی حیثیت سے اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید نہیں۔ دونوں میں قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ وہ انسانی جسم سے اخراج کے بعد دوبارہ بہت جلد اپنی کمی پوری کر لیتے ہیں۔

جن فقہاء کو خون کے استعمال اور دوسرے کے بدن میں اسے داخل کرنے میں تأمل ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ خون انسان کا جزء ہے اور جب اسے بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس اور ناپاک بھی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ عام حالات میں ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا جائز نہ ہو۔ اجزاء انسانی کی تکریم کا بھی یہی تقاضا ہے۔

جہاں تک خون کے انسانی جزء ہونے کا تعلق ہے تو اس میں غور کرنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لیے اعضاء انسانی میں قطع وبرید کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے اس کی مثال انسانی دودھ کی سی ہوگئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے نکلتا ہے۔ جہاں

تک اس کی حرمت کا معاملہ ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ علاجاً حرام اشیاء کا بھی استعمال درست ہے۔ اگرچہ امام ابوحنیفہؒ نے حرام اشیاء سے علاج کو منع کیا ہے، مگر فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہے، جو بعض احادیث کی بنا پر اس کو درست قرار دیتے ہیں:

''یجوز للعلیل شرب الدم و البول و أکل المیتة للتداوی إذا أخبره طبیب مسلم انّ شفاءه فیه و لم یجد فی المباح ما یقوم مقامه، و إن قال الطبیب یستعجل شفاءک، فیه و جهانِ، ۷؎

''کسی مریض کے لیے بہ طور علاج مردار کھانا، خون اور پیشاب پینا جائز ہے، بشرطے کہ کوئی مسلمان طبیب اسے بتائے کہ اس کے لیے اس میں شفا ہے اور جائز چیزوں میں کوئی ایسی چیز نہ ملے جو اس کی جگہ لے سکے۔ اگر طبیب کہے کہ اس کے ذریعہ شفا جلد ہوگی (گویا دوسری مباح چیزوں سے بدیر صحت یابی متوقع ہو) تو ایسی صورت میں دو قول ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ایک صحابی کو سونے کی ناک بنانے کی اجازت دی تھی، جب کہ سونے کا استعمال مردوں کے لیے حرام ہے۔ اسی حدیث کی بنا پر فقہاء نے دانت وغیرہ میں سونے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔

غیر مسلم کو خون کا عطیہ

ضرورت پڑنے پر ایک غیر مسلم کو بھی خون کا عطیہ دیا جا سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات اگر مذہبی منافرت دور کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہو تو وہاں مسلمانوں کو بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لینا چاہیے۔ دوسری چیز یہ کہ پوری انسانیت کو اللہ کا کنبہ کہا گیا ہے، اس اعتبار سے غیر مسلم کو خون دینے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ کیا کسی غیر مسلم کا خون مسلم کے بدن میں داخل کرنا جائز ہے؟ اور کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم کا عطیہ کیا ہوا خون لینا جائز ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ

نفس جواز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انسان ہونے کے لحاظ سے تمام انسانوں کے جسم یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کی طرح کافروں اور پرہیزگاروں کی طرح گنہگاروں کا جھوٹا بھی پاک ہے، یہی حکم خون چڑھانے اور خون کا عطیہ کرنے کا ہے، البتہ اگر اس میں احتیاط ممکن ہو تو بہتر ہے، کیوں کہ کفر اور فسق و فجور کے اثرات خبیثہ منتقل ہونے کا اندیشہ ہے۔

مریض کو خون دینے کی تفصیل

سوال نمبر (۲): کیا بلڈ بینکوں میں مسلمان خون کا عطیہ پیش کر سکتے ہیں؟

عام حالات میں (حالات کے فرق کے ساتھ) فقہاء نے خون دینے کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ اس طرح ہیں:

(۱) جب خون دینے کی ضرورت ہو، یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو خون دینا جائز ہے۔

(۲) جب خون دینے کی حاجت ہو، یعنی مریض کی ہلاکت کا خطرہ تو نہ ہو، لیکن ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دیے بغیر صحت کا امکان نہ ہو، اس وقت بھی خون دینا جائز ہے۔

(۳) جب خون دینے کی گنجائش ہو، مگر اس سے اجتناب بہتر ہو، مثلاً خون چڑھانے سے صحت جلدی بحال ہو جائے اور نہ چڑھانے کی صورت میں دیر سے بحال ہو۔ ایسی صورت میں دونوں اقوال ہیں۔

(۴) جب خون دینے سے محض منفعت یا زینت مقصود ہو، یعنی ہلاکت یا مرض کی طوالت کا اندیشہ نہ ہو، بلکہ محض قوت بڑھانا یا حسن میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں خون دینا جائز نہیں۔ ۸؎

مذکورہ بالا تفصیلات سے اشارہ ملتا ہے کہ عام حالات میں مسلمانوں کے لیے بلڈ بینکوں میں خون کا عطیہ مناسب نہیں ہے، کیوں کہ یہ ضرورتِ شدیدہ کے تحت نہیں آتا،

ہاں اگر ہنگامی اور غیر معمولی حادثات پیش آجائیں تو اس موقع پر مسلمانوں کو زخمیوں کو بچانے کے لیے، جب کہ ان زخمیوں کو خون کی ضرورت ہو، رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ کرنا چاہیے۔ محض امکانی ضرورتوں کے لیے بلڈ بینک میں خون جمع کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ انسانی اجزاء کے سلسلے میں مسئلہ یہی ہے کہ لین دین سے بچا جائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اگر معتبر طبیب کی رائے کے مطابق خون چڑھانا مریض کے لیے ضروری ہو تو ایسے مریض کو خون دینا جائز ہے۔۔۔لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب بہ حالت موجودہ کوئی ایسا مرض پیدا ہو گیا ہو کہ بہت سے لوگوں کو خون کی ضرورت ہو اور اس کے لینے کے لیے بلڈ بینک میں خون جمع کرنا ضروری ہو، تو ایسی صورت میں بھی خون دیا جا سکتا ہے، محض امکانی ضرورتوں کے لیے خون دینا درست نہیں، کیوں کہ انسانی اجزاء کے سلسلے میں مسئلہ یہ ہے کہ اس کے لین دین سے بچا جائے، تاہم یہ احکام اس وقت ہیں جب بلا قیمت رضا کارانہ خون دیا جائے۔ خون کا فروخت کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ ۹

رضا کارانہ بلڈ بینک کا قیام

سوال نمبر (۳): مسلمانوں کا رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا کیسا ہے؟

عام حالات میں محض امکانی ضرورتوں کے لیے مسلمانوں کا رضا کارانہ بلڈ بینک قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ خدمت خلق کے جذبے سے بھی کسی کام کو انجام دینے کے لیے شریعت کے اصولوں اور ضابطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، محض دوسروں کی نقل میں کسی کام کا انجام دینا اور اس کو بہتر اور مستحسن تصور کرنا، جب کہ شریعت کے اصول وضوابط سے وہ کام ٹکرا رہا ہو، کبھی بہتر نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی تاریخِ ولادت کے موقع پر اگر کوئی شخص ہسپتال جا کر خون کے ضرورت مند مریضوں کو اپنا خون دیتا ہے، تا کہ ہزاروں برادران وطن پر اس کا اچھا

اثر مرتب ہو اور غیر مسلموں میں یہ تأثر پیدا ہو کہ مسلمانوں کے پاس صرف لینے والا ہاتھ نہیں ہے، بلکہ دینے والا ہاتھ بھی ہے، تو یہ عمل پسندیدہ ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ شریعت کے اصول اور حکم منصوص کی خلاف ورزی نہ ہو۔

شدید ضرورت پر خون کا عطیہ

سوال نمبر (۴): اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو، لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ہی ملتا ہو، اور اسی گروپ کے خون کا حامل کوئی شخص موجود ہو تو کیا ایسے شخص کو اس مریض کو خون دینا واجب ہوگا؟ یا مستحب اور جائز؟

صورت مسئولہ میں ایسے شخص کا خون دینا جائز ہوگا، واجب اور مستحب نہیں۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ جب خون دینے کی ضرورت ہو، یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو تو خون دینا جائز ہے۔

لیکن اگر مریض کی ہلاکت یقینی ہو کہ اگر اس کے بدن میں مطلوبہ گروپ کا خون داخل نہ کیا گیا تو وہ مر جائے گا اور اس گروپ کے خون کا حامل اس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ملے ہی نہ اور اس شخص کے اندر مطلوبہ خون دینے کی صلاحیت ہو اور خود اس شخص کے بیمار اور کمزور ہونے کا خطرہ نہ ہو تو احقر کی رائے میں ایسے شخص کے لیے خون کا دینا مستحب ہی نہیں بلکہ واجب ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

جگر اور دیگر اعضاء کا عطیہ

سوال نمبر (۵): کیا انسانی جگر اور دیگر اعضاء کا عطیہ جائز ہے؟

جدید میڈیکل سائنس اور طبی ٹکنالوجی نے آج حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ آج کے زمانہ میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر ایک مردہ انسان کے جگر کی پیوند کاری دوسرے انسان کے جسم میں کر دی جائے، جب کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کو بالکل ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

کیا ایک انسان کے اعضاء کی دوسرے انسان کے جسم میں پیوند کاری کی جا سکتی ہے؟ کیا مرنے کے بعد اس شخص کی اجازت سے اس کے جگر کو نکال کر کسی متعین شخص کی جان کو بچایا جاسکتا ہے، یا کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دینے کی گنجائش ہے، تا کہ کسی انسان کو ضرورت پڑنے پر اس کی جان بچائی جا سکے؟ کیا مرحوم کے ورثاء کو اس کے جگر کا عطیہ کرنے کا حق ہے؟

اس سلسلے میں قدیم اور جدید علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ جو حضرات اعضاء کی پیوند کاری کو ضرورتاً جائز قرار دیتے ہیں، ان کے پیش نظر وہ فقہی قواعد ہیں جن کے مطابق ضرورت کی وجہ سے ناجائز چیزیں جائز قرار پائی ہیں اور ان قواعد کی تطبیق میں قرآن مجید کی وہ آیات بھی ان کے پیش نظر ہیں جن میں جان بچانے کے لئے اضطرار کی حالت میں حرام کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ (النحل: ۱۰۶۔ البقرة: ۱۷۳۔ المائدة: ۳) جواز کے قائلین اس سلسلے میں دیگر فقہی نظائر کو بھی پیش کرتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی جان کے تحفظ اور بقا کے لیے قابل احترام چیزوں کی اہانت بھی قبول کی جا سکتی ہے۔ علامہ سمرقندیؒ نے ایک خاص جزئیہ پر بحث کرتے ہوئے جس اصول سے استدلال کیا ہے وہ یہی ہے کہ ایک انسان کی بقا کے لیے دوسرے کی تکریم کے پہلو کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"لو أن حاملا ماتت وفی بطنها ولد یضطرب فإن کان غالب الظن انه ولد حیّ وهو فی مدة یعیش غالباً فانه یشقّ بطنها لأن فیه احیاء الآدمی فترک تعظیم الادمی أهون من مباشرة سبب الموت۔ ۱۰

'اگر کوئی حاملہ عورت مرجائے اور اس کے پیٹ میں بچہ ہو جو حرکت کرتا ہو، اگر غالب ظن یہ ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے اور اتنی مدت کا ہے جس میں عام طور پر بچہ زندہ رہ جاتا ہے تو اس حاملہ کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس میں ایک انسان کی زندگی بچانا ہے اور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے کہ آدمی کی تعظیم و تکریم کے تقاضے کو

چھوڑ دیا جائے‘۔

جن حضرات نے اعضاء کی پیوند کاری اور اعضاء و اجزاء انسانی کے ہدیہ اور عطیہ سے منع کیا ہے انہوں نے اس کے مختلف اسباب و وجوہ بیان کیے ہیں، مثلاً انسان کے علیحدہ شدہ اعضاء کا ناپاک ہونا، حرام ہونا، انسان کا خود اپنے جسم کا مالک نہ ہونا اور اللہ کی طرف سے اس کا امین ہونا وغیرہ۔ ان کی نظر میں عدم جواز کی جو اصل علت پیش نظر ہے وہ انسانی حرمت و کرامت کا تحفظ ہے۔ اکثر فقہاء نے انسانی اجزاء سے انتفاع کو اسی لیے ناجائز قرار دیا ہے کہ کہیں انسان متاعِ خرید و فروخت بن جائے۔ یہ اس کی شانِ تکریم کے خلاف ہے۔

صاحب مبسوط لکھتے ہیں:

وشعر الانسان والانتفاع به، ای لم یجز بیعه والانتفاع به، لأن الآدمی مکرم غیر مبتذل فلا یجوز أن یکون شیء من أجزائه مهاناً مبتذلاً ۱۱؎

”اور انسان کے بال سے نہ انتفاع جائز ہے نہ اس کی بیع جائز ہے۔ اس لیے کہ آدمی قابل تکریم ہے، نہ کہ قابل تصرف کوئی چیز، پس جائز نہیں ہے کہ اس کے اجزاء میں سے کسی بھی جزء کو ذلیل وحقیر کیا جائے اور استعمال کیا جائے‘۔

اور چوں کہ حرمت و کرامت اور عزت وتکریم میں زندہ و مردہ دونوں برابر ہیں اس لیے نہ زندہ انسان کے اعضاء اس مقصد کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں نہ مردہ کے۔

میری نظر میں قائلین عدم جواز کا موقف زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ شارع نے انسان کو مکرم و محترم بنایا ہے اور وہ اس کی توہین وتذلیل کو جائز نہیں رکھتا۔ اگر اعضاء انسانی کے ہبہ اور عطیہ کی اجازت دے دی گئی اور اسے پسندیدہ عمل باور کرا دیا گیا تو اندیشہ ہے کہ آنے والے وقت میں زندہ اور مردہ انسانوں کے اعضاء و اجزاء بکاؤ

مال ہو جائیں گے۔ کسی انسانی میت کی خیر نہیں رہے گی اور غسل، کفن دفن اور نماز جنازہ کے سارے قصے ختم ہو جائیں گے۔

انسان کے اعضاء واجزاء اس کی اپنی ملکیت نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، جن میں وہ مالکانہ تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے اعضاء واجزاء کو بیچے یا کسی کو ہبہ کے طور پر دے۔ اس معاملہ میں کسی کی اجازت اور رضامندی اور خود مرنے والے کی وصیت سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آنکھ یا دیگر اعضاء کا عطیہ اور وصیت:

جدید میڈیکل سائنس نے آج کافی ترقی کر لی ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایک انسان کے آنکھ کے قرنیہ (Cornea) کی اگر کسی نابینا کے حلقۂ چشم میں پیوندکاری کر دی جائے تو اس کو بینائی حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ پیوندکاری زندہ شخص کی آنکھ سے بھی کی جاسکتی ہے اور مرنے کے بعد بھی چند گھنٹے کے اندر مردہ شخص سے قرنیہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تو کیا کوئی زندہ شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کر سکتا ہے؟ ایسا کرنے میں اس شخص کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ میرا کام تو ایک آنکھ سے چل سکتا ہے، اگر کسی دوسرے شخص کا بھلا ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کیا موت کے بعد کسی شخص کا قرنیہ حاصل کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں کس کی اجازت معتبر ہوگی؟ اگر مرنے والے نے وصیت کر دی تھی تو کیا اس کی وصیت پوری کی جاسکتی ہے؟

اوپر اعضاء واجزاء کے ہبہ اور عطیہ سے متعلق تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں، مجوزین اور مانعین کے دلائل پر گفتگو کی جا چکی ہے اور جمہور کے موقف کی وضاحت بھی آچکی ہے۔ لہٰذا جو حکم جگر کے ہبہ اور عطیہ کا ہوگا وہی آنکھ کے عطیہ اور ہبہ کا ہوگا۔

جہاں تک اعضاء کی وصیت کرنے کی بات ہے، تو چوں کہ موت کے بعد انسان اپنے جسم کا مالک باقی نہیں رہتا، اس لیے اگر کوئی شخص ایسی وصیت کر جائے تو اس

کا اعتبار نہیں ہوگا۔ ایسی چیز کی وصیت کرنا درست نہیں جو اس کی ملکیت میں نہ ہو۔ نیز کسی شخص سے قرنیہ اس کی موت کے بعد بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس مقصد کے لیے آج جو آئی بینک قائم ہیں، جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر آنکھوں کا عطیہ کرتے ہیں، تا کہ ضرورت مند لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، ایسے بینک کو مردہ یا زندہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

بعض علماء اسے جائز قرار دیتے ہیں، تاہم یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کوئی مریض سامنے موجود ہو، نہ کہ متوقع مریض کے لیے۔ فاضل عضو سے مراد کیا ہے؟ اس کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس کو نکالے جانے کی وجہ سے اس کی جان ہلاکت میں نہ پڑے، جیسے کوئی شخص دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ کا قرنیہ اپنے بھائی کو، جو نابینا ہو چکا ہو، دے دے۔ بعض علماء اسے جائز اور بعض ناجائز کہتے ہیں۔

اعضاء واجزاء کے عطیہ میں کس کی اجازت معتبر ہوگی؟

اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ میں کس کی اجازت معتبر ہوگی؟ یعنی اگر مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ حاصل کرنا جائز ہو تو اس سلسلے میں کس کی اجازت معتبر ہوگی؟ خود اس شخص کی یا اس کے ورثہ کی؟ یا دونوں کی؟

اس سوال کا جواب ان لوگوں کے ذمہ ہے جو اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں میرا موقف ورجحان عدمِ جواز کا ہے۔ اس لیے میری نظر میں اس سلسلے میں کسی کی اجازت معتبر نہ ہوگی۔ کیوں کہ انسان کے اعضاء واجزاء اس کی اپنی ملکیت نہیں ہیں، جن میں وہ مالکانہ تصرف کرے، یا کسی کو اپنے جسم کا کوئی حصہ عطیہ کرے۔ جہاں تک وصیت کی بات ہے تو چوں کہ مرنے کے بعد انسان اپنے جسم کا مالک نہیں رہتا اس لیے اگر کوئی شخص ایسی وصیت کر جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ جس طرح مرنے کے بعد انسان اپنے جسم کا مالک نہیں رہتا اسی طرح وارثین پر اس کے مال کو تو شریعت کے مطابق تقسیم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لیکن اس کے جسم پر تصرف کا انہیں کوئی حق نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دودھ بینک کا قیام اور حکم شریعت

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ماں کا دودھ شیر خوار بچے کے لیے صحت بخش غذا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا خزانہ ہر ماں کے سینے میں رکھا ہے۔ جدید طب نے بھی اس کی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ اخبارات ورسائل اور پرنٹ والکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اس کی تشہیر کرائی جاتی ہے کہ نومولود اور شیر خوار بچے کے لیے ماں کے دودھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی غذا نہیں۔ زمانۂ قدیم میں عورتیں اپنے بچے کو بھی دودھ پلاتی تھیں اور دوسرے بچوں کو بھی اور انھیں اس کی متعین اجرت دی جاتی تھی۔ اسلام کی آمد کے بعد شریعت اسلامی نے رضاعت کو بھی حرمت مؤبّدہ کا سبب مانا اور اس کو ایک قانونی درجہ دیا۔

عصر حاضر میں یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کسب معاش میں لگ گئی ہیں اور ان کی مصروفیات اتنی زیادہ بڑھ گئی ہیں کہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کی انھیں فرصت نہیں۔ ان ملکوں میں اس مسئلہ کا حل یہ تلاش کیا گیا کہ وہاں دودھ بینک قائم کیے گئے ہیں۔ یہ بینک ان عورتوں کو جو اپنا دودھ فراہم کرتی ہیں، معاوضہ دیتے ہیں۔ اہل یورپ کی نقالی میں یہ بینک ہندوستان میں بھی قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔ کیا شریعت اسلامی کی روشنی میں اس طرح کا بینک قائم کرنا درست ہے؟ کیا اجرت لے کر یا بلا اجرت کسی عورت کا ان بینکوں میں دودھ فراہم کرنا جائز ہوگا؟ یورپی ملکوں میں جو مسلمان آباد ہیں، کیا مجبوری میں کوئی مسلمان عورت، جس کے اندر دودھ نہ ہو، ان بینکوں سے دودھ لے کر اپنے بچوں کو پلا سکتی ہے؟

اس طرح کا دودھ بینک قائم کرنا شریعت کی روشنی میں حرام ہے۔ جمہور علماء اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ کسی عورت کا اجرت لے کر یا بلا اجرت ان بینکوں میں دودھ فراہم کرنا جائز نہیں۔ جن مسلمان عورتوں کی چھاتی میں دودھ نہ ہو ان کے لیے بھی اس دودھ کا استعمال جائز نہیں ہے۔ وہ حلال جانوروں، مثلاً گائے، بھینس اور بکری کے دودھ کو استعمال کریں یا ڈبہ والا دودھ استعمال کریں۔ اگر یہ بینک خالص عیسائیوں اور

یہودیوں کے ہوں اور صرف ان ہی کی عورتوں کا اس میں دودھ ہو تب بھی مسلمان عورتوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہاں سے دودھ حاصل کرکے اپنے بچوں کو پلائیں، کیوں اس دودھ کے منفی اثرات ان بچوں پر پڑیں گے اور مستقبل میں حرمت رضاعت کے حوالے سے بھی مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں، مثلاً دودھ پینے والا بچہ، جو مسلمان ہے، بلوغ کے بعد شادی کی عمر کو پہنچ جائے اور کسی ایسی نومسلمہ یہودی یا عیسائی لڑکی سے شادی کرے جس نے اسی بینک کا دودھ استعمال کیا ہو اور دونوں نے جو دودھ استعمال کیا ہو وہ ایک ہی عورت کا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ اور فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والا فتاء نے بھی دودھ بینک کے قیام کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

رضاعت کے ثبوت کے لیے عورت کا چھاتی سے براہ راست دودھ پلانا شرط نہیں ہے۔ اگر کسی عورت نے اپنا دودھ اور مصنوعی دودھ ملا کر پلا دیا، یا پانی میں تحلیل کرکے پلا دیا اور دودھ کا وصف غالب رہا، یا عورت نے اپنا دودھ نکال کر کسی بچے کو پلا دیا ان تمام صورتوں میں رضاعت کا حکم ثابت ہوجائے گا۔ ۱۲؎

جمہور علماء مثلاً امام شعبہؒ، سفیان ثوریؒ جمہور احناف اور امام مالکؒ کے نزدیک رضاعت کے ثبوت کے لیے چھاتی سے دودھ پلانا شرط نہیں ہے، بلکہ سعوط اور وجور کی صورت میں بھی رضاعت ثابت ہوجائے گی۔ لیکن ایک دوسرا طبقہ علماء کا وہ ہے جو رضاعت کے ثبوت کے لیے عورت کا چھاتی سے دودھ پلانا شرط قرار دیتا ہے۔ اس فکر کے حامل داؤد ظاہری ہیں، امام ابواللیث کا مذہب بھی غالباً یہی ہے اور عطاء خراسانی وجور کی صورت میں رضاعت کے قائل ہیں، لیکن سعوط کی صورت میں ان کے نزدیک رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔ ۱۳؎

علامہ یوسف القرضاوی اور بعض دیگر علماء کی اس سلسلے میں ایک تجویز یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جمہور علماء کا مسلک درست ہے، لیکن اگر چند شرائط کا لحاظ کرلیا جائے اور اس پر پوری طرح عمل کیا جائے تو دودھ بینک قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے:

(۱) جس عورت کا دودھ حاصل کیا جائے اس کو الگ محفوظ ڈبہ میں رکھا جائے اور اس میں کسی اور عورت کا دودھ نہ ملایا جائے۔

(۲) اس عورت کا مکمل ریکارڈ محفوظ کر کے رجسٹر میں اس کا اندراج کیا جائے اور اس بوتل اور شیشی اور ڈبہ پر بھی اس کو چسپاں کر دیا جائے اور اس سلسلے میں پوری احتیاط برتی جائے۔ دودھ بینک میں دودھ دینے والی عورت کا مکمل نام، پتہ، ولدیت اور دیگر تفصیلات کو پوری دیانت داری کے ساتھ لکھ لیا جائے اور جس عورت اور مرد کو بچے کو دودھ پلانے کی خاطر وہ ڈبہ دیا جائے، اس کو پوری تفصیلات سے آگاہ کر دیا جائے اور حرمت کی دینی وشرعی حیثیت سے بھی اس کو آگاہ کر دیا جائے۔

(۳) دودھ بینک سے جو دودھ حاصل کیا جائے اس کو براہ راست نہ پلایا جائے، بلکہ اس کو مصنوعی دودھ یا گائے بھینس اور بکری کے دودھ میں یا کھانے کی چیزوں میں اس طرح خلط ملط کر دیا جائے کہ دودھ کا وصف مغلوب ہو جائے اور دوسری چیز اس پر غالب آجائے۔

مادۂ منویہ بینک اور حکم شریعت:

موجودہ مغربی تہذیب کی لعنت اور گندگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ آج یورپ اور اکثر مغربی ممالک میں مادۂ منویہ کے بینک قائم کیے گئے ہیں اور اس کو جدید میڈیکل ترقی کا نام دیا جارہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس طرح کے بینک یورپ کی نقالی میں مشرقی ممالک میں بھی قائم ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ جن مردوں کے مادۂ منویہ میں تولیدی صلاحیت کے جرثومے نہیں ہوتے ہیں ان کو یہ بینک کارگر جرثومے فراہم کرتے ہیں اور جن عورتوں میں تولید کے لائق بیضے پیدا نہیں ہو پاتے، ان کے لیے بیضے فراہم کرتے ہیں۔ اہل مغرب اس طرح کے بینکوں کی ضرورت کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں ذہنی ڈپریشن، حصول معاش اور تلاش معاش کی شب و روز فکر، عورتوں کے ملازمتیں کرنے، ایک عمر تک صنفی لذت اٹھانے کے لیے آزاد زندگی گزارنے وغیرہ کا منفی

نتیجہ یہ سامنے آرہا ہے کہ لوگوں میں بانجھ پن بڑھتا جارہا ہے اور اکثر جوڑے فطری طور پر اولاد سے بہرہ ور نہیں ہو پاتے۔ اس لیے مادۂ منویہ بینک قائم کیے جاتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ دودھ بینک کے مقابلہ میں ہزار بلکہ لاکھ گنا شناعت اور نامعقولیت مادۂ منویہ بینک کی ہے۔ ہر وہ شخص، جو دین فطرت پر قائم ہے اور جس کے اندر عقل سلیم ہے، وہ اس طرح کے بینک کے تصور ہی سے گھن کرے گا، چہ جائے کہ وہ اسے قائم کرنے کی فکر کرے، یا اس میں جا کر کسی ضرورت مند مرد یا عورت کو مادہ منویہ فروخت کرے، یا بغیر قیمت عطیہ کے طور پر دے، یا اس سے قیمۃً یا ہدیۃً جرثومے اور بیضے خریدے۔

اللہ تعالیٰ نے تولید کا فطری نظام یہ بنایا ہے کہ مرد اور عورت کے اتصال سے بچہ پیدا ہو۔ وہ کسی جوڑے کو صرف نر اولاد سے نوازتا ہے، کسی کو صرف مادہ اولاد سے اور کسی کو دونوں سے جب کہ کسی جوڑے کو بانجھ رکھتا ہے اور اسے اولاد سے محروم رکھتا ہے۔ کبھی تو یہ بانجھ پن شوہر اور بیوی دونوں کے اندر پایا جاتا ہے اور کبھی ان میں سے کسی ایک کے اندر۔ اب اگر مرد کے اندر بانجھ پن نہیں ہے اور اس کے اندر اولاد کے حصول کا بے پناہ جذبہ اور محبت ہے تو وہ اس کے لیے دوسری شادی کر سکتا ہے۔ اور اگر مرد کے اندر بانجھ پن ہے اور بیوی اولاد کے لیے تڑپ رہی ہے تو شریعت نے اس کو حق دیا ہے کہ وہ اس مرد سے خلع لے لے یا قاضی کے ذریعہ تفریق کرالے اور عدت کے بعد دوسری شادی کرلے اور اگر اللہ کی حکمت اور مصلحت پر راضی ہو کر اسی شوہر کے ساتھ رہنا چاہے تو اللہ کے یہاں ایسی عورت کا بڑا مقام ہوگا اور وہ اجر وثواب کی حق دار ہوگی۔

ایک مسلمان جو ثبوتِ نسب کے اسلامی قانون نیز اس کی حساسیت سے واقف ہو، وہ کیوں کر یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس طرح کے بینکوں سے کسی بھی صورت میں استفادہ کیا جائے، اسلام کے فطری قانون کا مذاق اڑایا جائے اور اللہ کی خلاقیت اور نظام فطرت سے بغاوت کی جائے۔

ادارتی نوٹ:

'اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ' کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا چوبیسواں فقہی سمینار یکم تا ۳؍مارچ ۲۰۱۵ء، دارالعلوم اسلامیہ اوچرا (کیرلہ) میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں جو مقالات پیش کیے گئے تھے اور مباحثات ہوئے تھے ان کا مجموعہ ایفا پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع ہو گیا ہے۔ (جنوری ۲۰۱۶ء، صفحات: ۶۴۱) اس موقع پر شرکاء سمینار نے بالاتفاق جو تجاویز منظور کی تھیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ خون انسانی جسم کا ایک بنیادی جزء ہے، جس سے حیات انسانی کی بقا مربوط ہے۔ اگر کسی انسان کو خون کی ضرورت پڑ جائے اور ماہر ڈاکٹر کی تجویز ہو کہ اس کے لیے خون ناگزیر ہے تو انسانی جان بچانے کے لیے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو عطیہ کرنا جائز ہے، اسی طرح کسی مسلمان کے لیے اس سے لینا بھی جائز ہے۔

۲۔ ایسے بلڈ بینک جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہیں اور وہ بینک ضرورت مندوں کو مفت خون فراہم کرتے ہیں، وہاں مسلمان کے لیے خون کا عطیہ کرنا جائز ہے۔

۳۔ رضا کارانہ بلڈ کیمپ لگانا اور بلڈ بینک قائم کرنا بھی انسانی ضرورت کے پیش نظر جائز ہے اور یہ انسانی خدمت میں شامل ہے۔

۴۔ ایسے نازک موقع پر جہاں خون کا عطیہ نہ کرنے کی صورت میں جان کا خطرہ ہے وہاں مطلوبہ گروپ کے حامل موجود شخص کے لیے اپنا خون عطیہ کرنا ایک اہم انسانی فریضہ اور شرعاً پسندیدہ ہے۔

۵۔ موجودہ طبی تحقیق کے مطابق زندہ شخص کے جگر کے بعض حصے کو دوسرے ضرورت مند انسان میں منتقل کرنا ممکن ہو گیا ہے اور عطیہ کرنے والے کے جگر کے بقیہ بچے ہوئے حصے کا چند مہینوں میں مکمل ہو جانا تجربہ میں آچکا ہے، اس لیے جگر کی منتقلی اور پیوند کاری اپنے کسی عزیز یا دوست کے لیے رضا کارانہ طور پر جائز ہے، البتہ خرید فروخت قطعاً جائز نہیں۔

۶۔ انسانی دودھ کا بینک قائم کرنا جائز نہیں۔ اگر بینک قائم ہو تو اس میں دودھ جمع کرنا اور اس میں کسی طرح کا تعاون کرنا بھی جائز نہیں۔

۷۔ مرد یا عورت کے مادۂ تولید کا بینک قائم کرنا یا کسی مرد یا خاتون کا کسی بینک کو یا کسی ضرورت مند کو مادۂ تولید فروخت کرنا یا بلا قیمت فراہم کرنا یا لینا حرام ہے۔

۸۔ زندہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ دوسرے ضرورت مندوں کے لیے منتقل کرنا جائز نہیں، البتہ مردہ کا قرنیہ کسی ضرورت مند کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فیصلہ کو مؤخر کیا جاتا ہے۔ (رضی الاسلام)

حواشی و مراجع

۱۔ مستفاد از جواہر الفقہ جلد دوم، ص ۲۴-۲۶

۲۔ الفتاویٰ الھندیۃ: ۵/ ۳۵۴

۳۔ جواہر الفقہ، جلد دوم، ص ۲۸-۲۹

۴۔ جواہر الفقہ، جلد دوم، ص ۴۳۔ ۴۴

۶۔ فتاویٰ عالم گیری، ج ۴، ص ۱۱۲

۷۔ الفتاویٰ الھندیۃ: ۵/ ۳۵۵

۸۔ جواہر الفقہ، جلد دوم، ص ۳۸

۹۔ کتاب الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۲۱۴

۱۰۔ تحفۃ الفقہائ: ۳/ ۳۴۳

۱۱۔ المبسوط ۱۵/ ۱۲۵

۱۲۔ فتاویٰ اللجنۃ: ۲۱/ ۴۲۔ ۴۳

۱۳۔ المغنی لابن قدامۃ: ۱۱/ ۳۱۳

☆☆☆

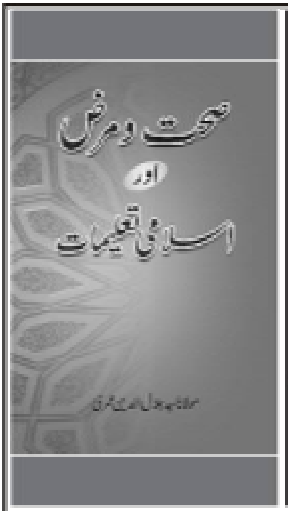

صحت و مرض
اور
اسلامی تعلیمات

صدر ادارۂ تحقیق و امیر جماعت اسلامی ہند

مولانا سید جلال الدین عمری

کے شگفتہ قلم سے قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کا جدید حالات کے پس منظر میں جس دیدہ ریزی سے جائزہ لیا گیا ہے اس نے اس کتاب کو ایک منفرد حیثیت دے دی ہے۔
کتاب کا یہ جدید ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور مزید مواد کے اضافہ کے بعد پیش کیا جارہا ہے۔ اس کے مطالعے سے جدید طبی مسائل میں اسلام کے موقف کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس کتاب کا ملیالم ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

● سائز : $\frac{23 \times 36}{16}$ ● صفحات : 384 ● قیمت : 250.00

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

D-307,Dawat Nagar,Abul Fazl Enclave,Jamia Nagar,New Delhi-110025
Phone: 26981652,26984347 Fax: 26987858
E-mail: mmipublishers@gmail.com • Website: www.mmipublishers.net

معاشی فلاح و بہبود کا اسلامی تصور

ڈاکٹر سعدیہ گلزار

اسلام عوام کی مادی اور روحانی فلاح کا ضامن ہے۔ وہ معاشرہ میں ایسے افراد تیار کرتا ہے جو دنیاوی اور اخروی دونوں زندگیوں میں سرخرو ہوسکیں ۔وہ ایسی معاشی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے جس سے معاشرے کے تمام طبقات مستفید ہوسکیں اور طبقاتی کش مکش جنم نہ لے سکے۔ اسلامی ریاست میں حکم راں طبقہ پر عوام کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اجتماعی سطح پر زکوٰۃ فلاح عامہ کا اہم ذریعہ ہے، جب کہ انفرادی سطح پر اسلام کا معاشی نظام انسانی فلاح و3 بہبود کے لیے انفاق فی سبیل اللہ سے متعارف کرواتا ہے۔جذبۂ اُخوت کے تحت معاشرے کے نادار، غریب اور کم استطاعت رکھنے والے افراد کی طرف وسائلِ رزق کو اس طرح منتقل کیا جاتا ہے کہ وہ مستقل طور پر معاشرہ کے کارآمد رکن بن سکیں۔اسلام میں معاشرے کے نادار اور بے سہارا افراد کی اعانت کی ترغیب دی گئی ہے، تاکہ معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں، ان کے درمیان اونچ نیچ جنم نہ لے اور کوئی ضرورت مند بھی باقی نہ رہے۔ اگر مسلمان انفاق فی سبیل اللہ کرتا ہے تو اپنے نفس کو مادی آلائشوں سے پاک کرلیتا ہے اور آخرت میں اجر وثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔اسلام ایسی معاشی فلاح و بہبود پر زور دیتا ہے جس سے ایک مسلمان دنیاوی زندگی کے ساتھ اپنی آخرت کو بھی سنوار سکتا ہے۔

ا۔ ریاست اور معاشی فلاح و بہبود

عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین کی مالیاتی پالیسی کا اہم مقصد عوام کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے مسلسل کوشش تھی۔اسلام کے نظامِ محاصل میں زکوٰۃ ایک جزء ہے۔ اس کی ادائیگی امراء پر لازم ہے، جس سے معاشرے کے نادار افراد کی ضروریات بہ طریق احسن پوری ہوتی رہیں۔عصرِ حاضر میں غربت و افلاس

اور ارتکازِ دولت جیسے اہم معاشی مسائل اُمت مسلمہ کو درپیش ہیں۔ انہیں زکوٰۃ کے ذریعے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ زکوٰۃ کا اہم مقصد غریبوں کی اعانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (التوبۃ: ۶۰)

'صدقات (زکوٰۃ وخیرات) صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جن کی دل جوئی مقصود ہوتی ہے اور گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے، فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ خوب علم وحکمت والا ہے'۔

اگر اسلامی ممالک میں نظام زکوٰۃ مؤثر ہو جائے تو اس سے ملکی سطح پر غرباء کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی، نیز ترقی یافتہ مسلم ممالک سے زکوٰۃ کی رقم پس ماندہ مسلم ممالک میں منتقل کرنے سے مجموعی طور پر مسلم امت معاشی طور پر خوش حال ہوسکتی ہے، یہاں تک کہ ایک ایسا دور آ سکتا ہے جب زکوٰۃ دینے والے ہاتھ تو ہوں، لیکن لینے والا کوئی نہیں ہو۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

تصدّقوا، فانه يأتي عليكم زمان يمشي الرّجل بصدقته فلا يجد من يقبلها، يقول الرجل: لو جئت بها بالأمس لقبلتها، فأمّا اليوم فلا حاجة لي بها۔

'خیرات کرو، کیوں کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ آدمی خیرات لے کر چلے گا لیکن اسے کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو اس کو قبول کرے۔ وہ جس کو دینے لگے گا وہ کہے گا اگر تو کل لاتا تو میں لے لیتا لیکن آج مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے'۔

یہ حدیث حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کی عکاسی کرتی ہے جب زکوٰۃ دینے والے تو ملتے تھے، لیکن لینے والے دست یاب نہیں تھے۔ عصرِ حاضر میں نظامِ زکوٰۃ کو حقیقی روح کے ساتھ نافذ کرنے اور زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ میں بدعنوانی کو ختم کرنے سے افراد کی معاشی فلاح و بہبود میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

اسلام میں ٹیکسوں کی وصولی میں بھی اصول فلاح کارفرما ہے۔ اسلامی ریاست کا شہری جبراً نہیں، بلکہ اپنی دنیاوی و اخروی فلاح سمجھ کر مالی واجبات ادا کرتا ہے۔ غرباء کو غیر ضروری ٹیکسوں میں نہیں جکڑا گیا ہے، بلکہ ان کی اعانت کے لیے زکوٰۃ کی ادائیگی معاشرہ کے صاحب نصاب افراد پر عائد کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ (الذّٰریٰت: ۱۹)

اور اُن کے مال میں مانگنے والوں کا اور سوال سے بچنے والوں کا حق تھا۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انہیں زکوٰۃ کی وصولی کی ہدایت ان الفاظ میں فرمائی:

فاعلمهم أن الله قد افترض عليهم صدقة فى أموالهم تؤ خذ من أغنيائهم و تردّ على فقرائهم [۲]۔

''ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں پر زکوٰۃ عائد کی ہے، جو ان کے مال داروں سے وصول کی جائے گی اور ان کے ضرورت مندوں میں تقسیم کی جائے گی''۔

اسلامی ریاست میں زکوٰۃ اور دیگر محاصل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو فلاح عامہ کے لیے مختص کیا جاتا ہے۔ عوام کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور عدل اجتماعی کا قیام حکومت کی ذمہ داری ہے، تاکہ معاشرے کے تمام افراد حکومت کی معاشی پالیسیوں سے مستفید ہوسکیں۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفاء راشدین کی معاشی پالیسیوں میں عوام کی فلاح و بہبود کو اولین ترجیح حاصل تھی، جس کی وجہ سے وہ معاشی طور پر خوش حال تھے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ لوگوں کے حالات سے آگاہی

کے لیے گشت فرماتے تھے۔ایک رات آپؓ نے ایک عورت کو بچوں کے ساتھ بھوکا پایا۔عورت نے خلیفۂ وقت کے بارے میں شکایت کی کہ وہ ہم پر حکومت کرتا ہے، لیکن ہمارے حال سے غافل ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ واپس بیت المال آئے اور وہاں سے آٹے کی بوری اپنی پیٹھ پر لاد کر عورت کے پاس لے گئے اور خود کھانا پکا کر بچوں کو کھلایا۔ ۳؎ عوام کی فلاح وبہبود کے ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ معیشت میں اشیاء کی قیمتوں میں استحکام رکھا جائے، کیوں کہ مہنگائی سے غرباء کی قوتِ خرید کم ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل سے قاصر رہتے ہیں۔

اسلامی ریاست میں تاجر کو نرخ گراں رکھنے اور غیر معمولی منافع کمانے کے لیے ایسے تمام معاشی امور سے روکا جاتا ہے جن سے صارفین کا استحصال ہو۔ مثلاً ذخیرہ اندوزی، ناپ تول میں کمی، ملاوٹ اور بددیانتی وغیرہ، نیز بازار پر نگرانی رکھی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جو غلہ بیچ رہا تھا۔ آپ نے اپنا دست مبارک اس غلہ میں ڈالا تو وہ اندر سے گیلا نکلا۔ آپؐ نے اس کی اس دھوکہ دہی پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا: **من غشنا فلیس منا** ۴؎ ''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں''۔اسی طرح خلفاء راشدین بھی اشیاء ضرورت کے نرخ معلوم کرتے رہتے تھے، تاکہ معیشت میں نرخ کی گرانی سے عوام مشکلات کا شکار نہ ہوں۔

عوام کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کے علاوہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی وسائل کی منصوبہ بندی کے لیے افراد کی اخلاقی تربیت، فنی اور رسمی تعلیم کی سہولیات اور باعزت روزگار کے مواقع فراہم کرے، تاکہ انسانی اور مادی وسائل سے معیشت ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

۲۔انفرادی ذمہ داری اور معاشی فلاح وبہبود

اسلام کا معاشی نظام انفرادی سطح پر انسانی فلاح کی ترقی کے لیے 'انفاق فی سبیل اللہ' کو متعارف کرواتا ہے۔ انفاق فلاح و بہبود کا ایک خودکار نظام ہے، جس سے غرباء کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں، معاشرتی بگاڑ نہیں پیدا ہوتا، نتیجتاً معاشی

خوش حالی کے ساتھ دولت کی تقسیم بھی منصفانہ رہتی ہے۔متعدد آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی میں انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارا گیا ہے۔معاشرے میں امراء کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے ضرورت مندوں، تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کی تعمیرات وغیرہ پر خرچ کریں۔مثال کے طور پر حضرت عثمان غنیؓ نے مدینہ میں میٹھے پانی کا کنواں خرید کر فلاح عامہ کے لیے وقف کر دیا تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے بارے میں فرمایا: **من یحفر بئر رومة فله الجنة** ۵؎ ’’جس نے بئر رومہ کو خرید کر اُمت کے لیے وقف کیا اُس کے لیے جنت ہے‘‘۔حضرت عمر فاروقؓ غیر منقولہ جائیداد کے پہلے وقف کرنے والے تھے۔انہوں نے اس کی آمدنی کو فقرائ، اقرباء، غلاموں کی آزادی، کارہائے خیر، مسافروں اور مہمانوں کے لیے وقف کر دیا۔۶؎ دیگر صحابۂ کرام بھی صدقات میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔جب انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: **لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ** (آل عمران: ۹۲) ’’تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب ترین چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کردو‘‘۔تو حضرت ابو طلحہ انصاریؓ، جو مدینہ میں صاحبِ حیثیت لوگوں میں سے تھے، نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا بیر حا نامی باغ، جو ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا، اسے اللہ کی رضا کے لیے صدقہ کر دیا۔نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مشورے سے انھوں نے اسے اپنے اقارب اور عم زادوں میں تقسیم کر دیا۔۷؎

اسلام بنیادی اخلاقی اقدار کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے، تاکہ ہر شخص کو اپنے حقوق و فرائض سے آگاہی ہو اور افرادِ معاشرہ کی معاشی ضروریات بھی بہ طریق احسن پوری ہوتی رہیں۔اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں باہمی اخوت و محبت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اسلام اہل ایمان کو رشتۂ اخوت میں منسلک کرتا ہے۔نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے: ’’مومن مومن کا بھائی ہے۔وہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف رہتا

ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کا کفیل ہو جاتا ہے اور جو شخص کسی مومن کی ایک تکلیف دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکالیف میں سے ایک تکلیف دور فرمائے گا اور جو کسی مومن کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا''۔ ۸؎ ''مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی مانند ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے''۔۹؎ اسلامی تعلیمات کی رُو سے ''اہل ایمان جسم واحد کی مانند ہیں۔ اگر اس کے کسی ایک عضو میں درد ہو تو پورا جسم اس درد میں شریک ہوتا ہے''۔ ۱۰؎ جسد واحد کا یہ تصو مومن کو ذاتی مادی منفعت کو ترجیح دینے کے بجائے اپنے بھائی کی تکالیف دور کرنے اور اس کے معاشی مفاد کو مدنظر رکھنے پر ابھارتا ہے۔ اسلام مسلمانوں میں اتحاد و اخوت کو فروغ دینا چاہتا ہے ۔اسلامی تعلیمات میں اپنے مسلمان بھائی کو عمدہ چیز دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: ''قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی شخص اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔ ۱۱؎ اسلام خیر خواہی، قربانی، ایثار، تعاون اور احسان کا دین ہے۔ تمام مسلمان مشکلات میں ایک دوسرے کے دست و بازو بنتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی مشکل صورت حال سے دو چار ہو جائے تو دوسرے مسلمان اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مشکل سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جو دنیا کے معاشی نظام کو قائم رکھتی ہے اور احسان کی آمیزش اس معاشی نظام کو مضبوط بناتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اسلام ایثار و مواسات کی ترغیب دیتا ہے۔ 'احسان' ہر نیکی کے کام پر محیط ہے۔ قرآن مجید میں اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ (القصص:۷۷)

''اور جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اچھا سلوک کر''۔

إِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الإِحْسَانِ وَ إِیْتَاءِ ذِیْ الْقُرْبَی (النحل: ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

وَ یُؤْثِرُونَ عَلَی أَنفُسِهِمْ وَ لَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹)

بلکہ وہ خود اپنے اوپر انھیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود انھیں کتنی ہی سخت حاجت ہو۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اس کو کون مہمان بنائے گا؟ انصار میں سے ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم! میں یہ خدمت انجام دوں گا۔ گھر جا کر اس نے بیوی سے کہا کہ مہمان کی خاطر تواضع کرو۔ بیوی نے کہا کہ گھر میں بچوں کے کھانے کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ اس نے بچوں کو بھوکا سلا دیا، کھانے کے وقت چراغ گل کر دیا اور گھر میں جو کچھ تھا، مہمان کو پیش کر دیا، جس نے سیر ہو کر کھانا کھایا، انصاری اور اس کے اہل خانہ بھوکے سوئے۔ صبح نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو گزشتہ رات مہمان کی تمہاری ضیافت بہت پسند آئی۔ ۱۲

یہ جذبۂ احسان و ایثار ہی ہے جس کی وجہ سے نادار، مساکین اور کم استطاعت رکھنے والے افراد کی طرف وسائل رزق اس طرح منتقل ہوتے ہیں کہ وہ مستقل طور پر معاشرہ کے کارآمد رکن بن سکیں۔ مالی و جسمانی اعانت، اجتماعی زندگی کی روح اور اس کے سکون کا ذریعہ ہے۔ جس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں وہ پرسکون اور خوش حال معاشرہ ہوتا ہے۔

اسلام کے فضائلِ اخلاق میں شامل ہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کی جائے اور بھوکے کو کھانا کھلایا جائے۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سوال کیا: کس قسم کا اسلام بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: **تطعم الطعام و تقرا السلام علی من عرفت و من لم تعرف** ۱۳ ''کھانا کھلاؤ اور سلام کرو جس کو جانتے ہو اور جس کو نہ جانتے ہو''۔

قرآن و حدیث کی اخلاقی تعلیمات میں صلہ رحمی اور حقوق قرابت پر زور دیا

گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ (الروم: ۳۸) پس قرابت داروں کو اس کا حق دیجیے۔

نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

من سرّہ أن یبسط لہ فی رزقہ و ینسأ لہ فی عمرہ فلیصل رحمہ [۱۴]

''جس کو یہ پسند ہو کہ اس کے رزق میں وسعت اور اس کی عمر برکت ہو تو صلہ رحمی کرے''۔ [۱۴]

اسلام کے معاشی نظام میں ہر شخص کو ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ کسی کو معاشی تنگی کا احساس نہ ہو۔ اسی طرح پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی گئی ہے۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوستوں کے لیے بہترین ہے اور اللہ کے ہاں بہترین ہم سایہ وہ ہے جو اپنے ہم سایوں کے لیے بہتر ہے''۔ [۱۵] نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کھانے پکاتے ہوئے بھی ہم سایہ کا خیال رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ آپؐ نے حضرت ابوذرؓ کو تاکید فرمائی: ''اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کرلیا کرو اور اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کیا کرو''۔ [۱۶]

کسی بھی معاشرے کے افراد کی فلاح و بہبود میں اضافہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جز قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ مہمان کی عزت کرے''۔ [۱۷] اسلام مہمانوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کی تلقین کرتا ہے، اگرچہ وہ اجنبی ہوں۔ اسوۂ حسنہ سے ثابت ہے کہ عمدہ مہمان نوازی سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوجایا کرتے تھے۔

اسلام کے نظام اخلاق میں یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ برے سلوک کی سخت ممانعت کرتے ہوئے دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَرَأَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ
(الماعون:۱-۲)

'کیا تونے (اُسے) دیکھا جو (روز) جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہی وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے'۔

اہل ایمان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ رضاالٰہی کے لیے یتیموں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً (الدھر:۸)

اور اللہ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین، یتیم اور قیدیوں کو۔

خلفاء راشدین نے یتیموں کی معاشی کفالت کے لیے وظائف مقرر کیے، مکاتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور شادی بیاہ کی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام کیا۔ اسلام بیوہ عورت کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ کی کفالت کرنے والے شخص کو اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے سے تشبیہ دی ہے۔ ۱۸؎ حضرت عمر فاروقؓ بیواؤں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''اگر میں زندہ رہ گیا تو اہل عراق کی بیواؤں کو ایسا چھوڑوں گا کہ میرے بعد وہ کسی امیر کی محتاج نہ رہیں''۔ ۱۹؎

۳۔ روحانی فوز وفلاح

اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کی روشنی میں ایک فرد یا ایک قوم روحانی اور مادی دونوں طرح کی ترقی کے منازل آسانی سے طے کرسکتی ہے۔ اسلام معاشی فلاح و بہبود کا خواہاں ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ اخلاقی و معاشرتی اقدار میں بھی بہتری آئے۔ اسلام میں معاشی فلاح و بہبود کا تصور محض افراد کی آمدنیوں میں اضافہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ وہ روحانی فلاح بھی چاہتا ہے۔ فلاح و بہبود کا تصور تزکیہ کے ساتھ وابستہ ہے، کیوں کہ ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیہ ہے۔ قرآن مجید میں تزکیۂ نفس کے بارے میں ارشاد ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكّٰهَا وَقَدْ

خَابَ مَن دَسّٰهَا (الشّمس ۷—۱۰)

اور نفس انسان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کو برائی (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔ جس نے اس کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ ناکام ہوا۔

گویا اسلام ایسی معاشی فلاح و بہبود پر زور دیتا ہے جس میں افراد روحانی اور ذہنی طور پر مطمئن ہوں۔ تزکیۂ نفس کا ایک اہم ذریعہ زکوٰۃ بھی ہے۔ مال کی ادائیگی سے انسان کا نفس بخل سے پاک ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی نفس کی اصلاح اور روحانی فلاح ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی وَلَسَوْفَ یَرْضٰی (الیل:۱۸—۲۱)

جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے، کسی کا اُس پر کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو، بلکہ صرف اپنے پروردگار بلند و بالا کی رضا چاہنے کے لیے۔ یقیناً وہ (اللہ تعالیٰ بھی) عن قریب رضامند ہو جائے گا۔

افراد کی اخلاقی و روحانی تربیت کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسا ماحول پیدا کرے جس میں افراد آسانی سے اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بسر کر سکیں۔ خلفاء راشدین نے احیاء دین کے لیے کوششیں کی، جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے حکام کو مقرر کرنے کا مقصد لوگوں کو دینی امور سکھانا بھی تھا:

یا ایها الناس! انی واللّٰہ ما أرسل الیکم عمّالاً لیضربوا أبشارکم، ولا لیأخذوا أموالکم، و لکني أ ر سلهم الیکم لیعلّموکم دینکم و سنّتکم، فمن فعل به شيء سوی ذلک فلیرفعه الیّ، فو الذي نفس عمر بیده لأقصنّه منه[۲۰]

اے لوگو! اللہ کی قسم میں تمھاری طرف حکّام کو اس لیے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ

تمھاری چمڑیاں ادھیڑ یں یا تمھارا مال چھینیں، بلکہ میں انھیں اس لیے بھیجتا ہوں کہ وہ تمھیں تمہارے دین اور سنت نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم دیں۔ جو کوئی اس کے علاوہ کوئی کام کرے تو مجھے اس کے متعلق مطلع کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں عمر کی جان ہے، میں اس سے ضرور قصاص لوں گا۔

ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کی ممانعت

اسلام معاشی فلاح و بہبود میں اضافہ کے لیے ناجائز ذرائع دولت کا سدّ باب کرتا ہے، تاکہ معیشت میں کوئی شخص کسی کا استحصال نہ کر سکے۔ وہ ایسی تمام معاشی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرتا ہے جو انسانی فلاح میں اضافہ کرنے کے بجائے اس میں کمی کا باعث بنتی ہیں، مثلاً رشوت، غصب، خیانت، چوری، مال یتیم میں بے جا تصرف، ناپ تول میں کمی، فحاشی پھیلانے والے کاروبار، قحبہ گری اور زنا کی آمدنی، شراب کی صنعت اور اس کی تجارت میں سٹہ بازی اور سود خوری وغیرہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ (النسآء: ۲۹)

اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضامندی سے خرید و فروخت ہو۔

حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان دار بندوں کو ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت کی ہے، خواہ وہ ایسی کمائی ہو جو شرعاً حرام ہے، مثلاً سود خوری، قمار بازی یا ایسے حیلے ہوں جو بہ ظاہر شرعی دائرے میں آتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان حیلوں کا اختیار کرنے والا اصلاً سود خوری چاہتا ہے۔" ۲۱

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ حرام کاروبار کی ممانعت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''دولت کمانے کے ذرائع میں اسلام نے جتنی باریک بینی کے ساتھ جائز و ناجائز کی تفریق کی ہے، دنیا کے کسی قانون نے نہیں کی۔ وہ چن چن کر ان تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے جن سے ایک شخص دوسرے شخص کو یا بہ حیثیت مجموعی پوری سوسائٹی کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچا کر اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کو بنانا اور بیچنا، فحش کاری اور رقص وسرور کا پیشہ، جوا، سٹہ بازی، لاٹری، سود، قیاس، دھوکے اور جھگڑے کے سودے ایسے استحصالی طریقے ہیں، جن میں ایک فریق کا فائدہ یقینی اور دوسرے کا مشتبہ ہو۔ ضرورت کی چیزوں کو روک کر ان کی قیمتیں چڑھانا اور اسی طرح کے بہت سے وہ کاروبار جو اجتماعی طور پر ضرر رساں ہیں، اسلامی قانون میں قطعی حرام ہیں''۔ ۲۵؎

ناجائز کاموں کی ممانعت کا اصل مقصد انسانی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھنا ہے، تاکہ کوئی شخص ان اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہوکر معاشرہ میں فساد برپا کرنے کا باعث نہ بنے۔ معاشی جدوجہد میں اسلام کے متعین کردہ اخلاقی اصول ہی انسانی فلاح کے ضامن ہیں۔ ان اصولوں سے معیشت ترقی کی راہ پر گام زن ہوسکتی ہے۔ شریعت اسلامیہ نے ناجائز مال کمانے کے تمام طریقوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور انسان کو حلال ذرائع سے روزی کمانے کا پابند کیا ہے۔ اگر انسان حرام ذرائع استعمال کرتا ہے تو وہ اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ٹھہرتا ہے اور اپنی آخرت کو برباد کرلیتا ہے۔

ارتکازِ دولت کی حوصلہ شکنی

اسلامی تعلیمات میں معاشرہ میں فلاح و بہبود میں کمی کرنے والے تمام ناجائز امور کی ممانعت کی گئی ہے۔ مغربی مفکرین نے سود کو عامل پیدائش کی حیثیت سے معاشی سرگرمیوں میں شامل کر رکھا ہے، جس کا انسانی فلاح و بہبود کو تباہ و برباد کرنے میں اہم کردار رہا ہے۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے، کیوں کہ وہ معاشی

فلاح وبہبود میں اضافہ کرنے کے بجائے ارتکازِ دولت کو تقویت دیتا ہے، جس سے معاشرہ دو طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک طبقہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا ہے، جب کہ دوسرا طبقہ غربت وافلاس کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ غریب طبقہ ہی امیر طبقہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرتی امن وسکون ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی اس ضمن میں بیان کرتے ہیں:

"سود کی وجہ سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ نچلا اور متوسط طبقہ بے روزگاری اور گرانی کے پاؤں کے درمیان پستا چلا جاتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ اپنی سود کی غیر محنتم آمدنی پر عیش کرتا ہے"۔ ۲۶

اسلام نے سود کو حرام کیا ہے اور زکوٰۃ کو گردش دولت کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے جو معاشرے کے امراء سے وصول کر کے غرباء میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اکتناز وارتکاز کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ وصدقات، وراثت اور انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم کے ذریعے دولت کی گردش کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ عہد نبویؐ اور عہد خلفاء راشدین میں زکوٰۃ و عشر کا نظام رائج تھا۔ انفاق فی سبیل اللہ میں صحابہ کرام ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ خلفاء راشدین نے متوازن معاشی پالیسیوں کے ذریعے دولت کی منصفانہ تقسیم کا اہتمام کیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں عراق وشام، سواد میں حلوان وقادسیہ کی مفتوحہ زمینوں کو فوجیوں کے درمیان تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۷ کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ زمین کی ملکیت ایک محدود طبقہ میں گھر کر رہ جائے اور باقی افراد اس سے محروم رہیں۔ ان کی اس پالیسی سے جاگیردارانہ نظام کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

علاقائی عدم مساوات

ملک میں بسنے والے تمام باشندوں کو بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی اور ترقیاتی ثمرات سے مستفید ہونے کا حق ہے۔ ملک کے ایک علاقے یا صوبہ کو ترقیاتی کاموں میں سرفہرست رکھنے اور دیگر علاقوں کو نظر انداز کرنے سے پس ماندہ علاقوں کے افراد میں بے چینی جنم لیتی ہے، نیز قومیت کا فتنہ پروان چڑھتا ہے، جو ملکی امن وسکون کو

تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ معاشی فلاح کی پالیسیوں پر عمل درآمد متاثر ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفاء راشدین نے اسلامی ریاست کے تمام علاقوں کے باشندوں کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھا۔ حضرت عمرؓ فاروق کے دور میں سلطنت بہت وسیع ہو گئی تھی۔ مگر وہ جتنے بھی گورنر مقرر فرماتے، ان کو عوام کی فلاح و بہبود اور ان کے زیر انتظام علاقوں کی ترقی کے لیے تجاویز دیتے۔ صوبوں کو مرکز کے ساتھ مربوط رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دور میں قومیت کے فتنہ نے سر نہیں اٹھایا، حالاں کہ ایران و عراق، شام اور مصر تک اسلام کی سرحدیں وسیع ہو گئی تھیں۔ حکم راں کی ذمہ داری ہے کہ تمام علاقوں کی ترقی کے لیے پالیسی بنائے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ سائب بن یزیدؒ کہتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کو یہ فرماتے سنا: ''اللہ کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کے ایک ایک چرواہے کو اس کا حصّہ وہیں بیٹھے بیٹھے ملے گا۔ ۲۵؎ انہوں نے مختلف علاقوں مثلاً یمن، شام اور عراق جیسے دور دراز کے لوگوں کے لیے وظائف جاری کیے۔ ۲۶؎

اگر کبھی بعض خاص وجوہ کی بنیاد پر معاشی معاملات میں کمی بیشی روا رکھی گئی تو اس کو واضح کیا گیا۔ مثلاً رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے غزوۂ حنین کے مال غنیمت میں سے کچھ لوگوں کو سو سو اونٹ دیئے، جس پر انصار کے بعض لوگوں کو اعتراض ہوا تو آپؐ نے وضاحت فرمائی کہ میں نے انہیں حق کی بنا پر نہیں، بلکہ تالیف قلب کے لیے زیادہ دیا ہے۔ ۲۷؎

درحقیقت فلاح عامہ کے اسلامی اصول حقیقی معنیٰ میں نافذ کرنے سے معاشرہ خوش حالی کے راستے پر گام زن ہوتا ہے۔ اسلام ایسی معاشی فلاح و بہبود پر زور دیتا ہے جس سے افراد مادی اور روحانی دونوں اعتبار سے مطمئن ہوں۔ عصر حاضر میں زکوٰۃ کی لازمی بنیادوں پر وصولی، کرپشن کے خاتمہ، ٹیکس میں رائج خرابیوں کی اصلاح، عوام کو بنیادی ضروریات کی بلا معاوضہ فراہمی، فلاح عامہ کے ترقیاتی پراجیکٹس کا بڑے شہروں

کے علاوہ چھوٹے اور پس ماندہ علاقوں میں آغاز اور معاشرتی اقدار میں بہتری سے فلاحی ریاست کا قیام ممکن ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصّدقۃ قبل الردّ، ۱۴۱۱

۲۔ بخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، ۱۳۹۵؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الدعاء الی الشھادتین وشرائع الاسلام، ۱۲۱

۳۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری)، دارالکتب العلمیۃ، بیروت (لبنان)، ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ئ، طبع دوم: ۲/۵۶۸

۴۔ ابوداؤد، البیوع، باب فی النہی عن الغش، ۳۴۵۲؛ ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراہیۃ الغش فی البیوع، ۱۳۱۵

۵۔ بخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عثمان بن عفان؛ ترمذی، أبواب المناقب، باب فیعدّ عثمان تسمیۃ شھیداً وتجہیزہ جیش العسرۃ، ۳۷۰۳

۶۔ ابن سعد، الطبقات الکبری، داربیروت، بیروت (لبنان)، ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ئ: ۳/۲۷۳

۷۔ بخاری، کتاب التفسیر، باب لن تنالوا البرّ حتی تنفقوا ممّا تحبّون، ۴۵۵۴؛ ترمذی، أبواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ آل عمران، ۲۹۹۷

۸۔ بخاری، کتاب المظالم، باب لایظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ، ۲۴۴۲؛ مسلم، کتاب الأدب، باب تحریم الظلم، ۶۵۷۸

۹۔ بخاری، کتاب المظالم، باب نصر المظلوم، ۲۴۴۶؛ مسلم، کتاب الأدب، باب تراحم المومنین، ۶۵۸۵

۱۰۔ مسلم، کتاب الأدب، باب تراحم المومنین، ۶۵۸۸

۱۱۔ بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان أن یحبّ لأخیہ ما یحبّ لنفسہ، ۱۳

۱۲۔ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قول عزوجل: وَیُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ، ۳۷۹۸؛ مسلم، کتاب الاطعمۃ، باب اکرام الضیف، ۵۳۵۹

۱۳۔ حوالہ سابق، ، باب اطعام الطعام من الاسلام، ۱۲

۱۴۔ بخاری، کتاب الأدب، باب من بسط لہ فی الرزق لصلہ الرحم، ۵۹۸۶

۱۵۔ ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی حق الجوار، ۱۹۴۴

۱۶۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ، ۶۶۸۸

۱۷۔ بخاری، کتاب الأدب، باب اکرام الضّیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ، ۶۱۳۶

۱۸۔ حوالہ سابق، کتاب الادب، باب الساعی الی المسکین، ۶۰۰۷

۱۹۔ ابویوسف، کتاب الخراج، دار المعرفۃ، بیروت (لبنان)، ص ۳۷

۲۰۔ تاریخ الامم والملوک: ۲/۵۶۷

۲۱۔ الطبقات الکبری: ۵/۳۴۲

۲۲۔ حوالہ سابق: ۵/۳۴۵۹

۲۳۔ سیوطی، جلال الدین، تاریخ الخلفاء، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ئ، ص ۱۹۹

۲۴۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر)، دار السلام، ریاض، ۱۴۱۸ھ: ۱/ ۶۳۷

۲۵۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، معاشیات اسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۷

۲۶۔ حرمت ربا اور غیر سودی بینکاری نظام، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۲۸

۲۷۔ ابوعبید، قاسم بن سلام، کتاب الأموال، دار الفکر، قاہرہ (مصر)، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء، ص ۶۱

۲۸۔ الطبقات الکبری، ۳/۲۹۹

۲۹۔ بلاذری، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۲۰ھ/ ۲۰۰۰ئ، ص ۲۳۸

۳۰۔ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ الطّائف، ۴۳۳۴

☆☆☆

سیر وسوانح

شیخ محی الدین ابن عربی اوران کی تفسیر

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

عربوں کے ذریعہ اندلس جیسے دیارِ غیر میں بلاشرکت غیرے تقریباً تین سو سال تک سیادت وحکمرانی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اگرچہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں ہی موسیٰ بن نصیر کی سرپرستی میں کاروان عرب نے فتح وظفر کے پرچم لہرادیے تھے اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں ایک قلیل عرصے میں ہی خوش گوار تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، تاہم ۱۳۲ھ کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب اموی حکومت کی حشمت واقتدار کا سورج مشرق میں غروب ہوا تو معاویہ بن ہشام کے بیٹے عبدالرحمن الداخل کی شکل میں اسی خاکستر کی ایک چنگاری دیارِ مشرق سے اٹھی اور اس نے بادمخالف کا مقابلہ کرتے ہوئے دیارِ مغرب کو اپنا ماوی ومستقر بنایا۔ پھر جب اس کے سر پر تاجِ امارت رکھا گیا تو اندلس میں تازگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ عرب حکمرانوں نے اپنے خون جگر سے اس دیار کی آبیاری کی، جس کے نتیجے میں اندلس ظاہری اور معنوی دونوں طریقوں سے شاداب اور لہلہاتی فصل میں تبدیل ہو گیا اور اس کی حیثیت تماشا گاہ عالم کی ہو گئی۔

اندلس کے مفسرین، محدثین، فقہاء اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین کی اس جاذب نظر کہکشاں میں ایک فقید المثال شخصیت وہ ہے جو دنیائے علم وفضل میں ابن عربی کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کی ولادت ۱۷؍رمضان ۵۶۰ھ میں اندلس کے شہر مرسیہ میں ہوئی۔ آپ کا اسم گرامی محمد، کنیت ابوبکر اور لقب محی الدین ہے۔ علی بن محمد الحاتمی الطائی آپ کے والد محترم ہیں۔ آپ نے متعدد شادیاں کیں، جن سے کئی اولاد بھی ہوئیں، لیکن سعدالدین محمد اور عمادالدین ابوعبداللہ نے بڑی شہرت ومقبولیت پائی۔ [۱]

ابن عربی نے دینیات اور معاصر علوم کی تحصیل کے بعد میدان تصوف کا رخ کیا اور اندلس اور افریقہ کے مشاہیر اساتذۂ کی حاشیہ نشینی اختیار کی۔ اگرچہ انھوں نے اپنی ابتدائی نصف زندگی اندلس اور شمالی افریقہ کے نواح میں گزاری، لیکن ان کا کمال آب وتاب کے ساتھ مشرق میں جلوہ گر ہوا اور یہیں ان کی شاہ کار تصنیفات منظر عام پر آئیں۔ ۲؎ ان کی ابتدائی دور کی تصنیفات بیش تر رسالوں کی شکل میں ہیں، جو ان کی پختگی فکر اور دقت نظر پر دلالت نہیں کرتیں، البتہ آخری بیس سالوں کی تحریریں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ وہ ان کے مضبوط فکر ونظر کی غماز ہیں اور ان پر باطنیت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ ۳؎

شیخ ابن عربی اپنی کثرت تالیفات کے لیے مشہور ہیں۔ فصوص الحکم اور الفتوحات المکیۃ ان کی آخری دو اہم ترین کتابیں ہیں، جو اواخر عمر کی عظیم الشان یادگاریں ہیں اور جن سے دین ودنیا اور بالخصوص خدا اور کائنات سے متعلق ان کے پختہ فکر ونظر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اول الذکر تصنیف ۶۲۷ھ میں دمشق میں لکھی گئی، جب کہ آخر الذکر کا مقام تصنیف مکہ مکرمہ ہے۔ ان دو کتابوں سے ان کے فکر ونظر کے تعمق اور مخصوص فلسفہ (وحدۃ الوجود) کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے، لیکن دوسری تالیفات وتصنیفات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے، تاکہ ان کی شخصیت کی غیر جانب دارانہ اور غیر متعصّبانہ تصویر سامنے آسکے۔ ان کا شمار بلاشبہ کثیر التصانیف مصنفین ومؤلفین میں ہوتا ہے۔ بعض سوانح نگاروں نے ان کی تصنیفات کی تعداد پانچ سو (۵۰۰) بعض نے چار سو (۴۰۰) اور بعض نے دو سو چوراسی (۲۸۴) بتائی ہے۔ شیخ نے اپنی وفات سے چھ سال قبل ۶۳۲ھ میں اپنی ایک یادداشت تحریر کی تھی، جس میں اپنی تالیفات وتصنیفات کی تعداد دو سو اکیاون (۲۵۱) بتائی تھی۔ ۴؎ ابن عربی کی جامع صفات شخصیت کا تعارف ان کے ایک سوانح نگار نے ان الفاظ میں کرایا ہے:

> وکان رضی اللّٰہ عنہ شیخاً جلیلاً، عالی القدر، واسع الصَّدر، متمکناً مِنَ العلوم الشرعیۃ، راسخاً فی اسرار المعارف الحقیقیۃ وفی سائر

العلوم التی حارت فیها الأفهامُ و الحُلومُ، وکان أوحدَ أهل زمانه وأسْعَدَ اقرانه وأنجَدَ اخوانه، لم یکن فی عصره من یوازیه ولا فی دهره من یدانیه وکان فی عصره من العلماء الأبرار و المتکلمین النّظار، الفقهاءِ الأخیار و المشائخ الکبار مالم یوجد فی عصر من الاعصار و کُلّهم أقروا بعلمه واعترفوا بفضله۔ ۵؎

''وہ (اللہ ان سے راضی ہو) شیخ جلیل، اعلیٰ قدر ومنزلت کے مالک اور کشادہ قلب تھے، شرعی علوم پر دست گاہ رکھنے والے، معارف حقیقیہ اور ان تمام علوم کے اسرار میں پختہ تھے جن میں فہم ودانش حیران رہتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں منفرد، اپنے دوستوں میں بڑے سعادت منداور اپنے رفقاء میں سب سے بڑھ کر دست گیری کرنے والے تھے۔ ان کے زمانے میں کوئی ان کا حریف اورہم پلہ نہیں تھا۔ اپنے زمانے کے صالح علمائ، عمیق نظر رکھنے والے متکلمین، نیک فقہاء اور ان بڑے مشائخ میں تھے جو کسی زمانے میں نہیں پائے جاتے۔سب نے ان کے علم کا اقرار کیا ہے اوران کے فضل کا اعتراف کیا ہے''۔

ابن عربی ایک صوفی فلسفی ہونے کے علاوہ ایک اچھوتے انداز فکر کے حامل تھے۔ ان کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کا کون سا پہلو نمایاں اور غالب ہے؟ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک صوفی فلسفی اور وجودیت یا توحید وجودی سے موسوم ایک نئے دبستان فکر کے مؤسس تھے،لیکن فکر ونظر کی بلندی کے ساتھ صوفیانہ جذبات سے متصف ہونے کی بنا پر ان کی تحریروں میں مضبوط و مستحکم استدلال کی کیفیت نہیں پیدا ہو پاتی۔ ان کے اسلوب سے متعلق دائرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

''ابن عربی کے اسلوب میں یکسانیت نہیں ہے۔ان کا انداز بیان، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا انداز فکر وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو واضح اور سلیس انداز اختیار کر لیتے ہیں، ورنہ وہ بے حد مغلق اور مبہم اسلوب

سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ دراصل اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انھوں نے کس موضوع پر قلم اٹھایا ہے؟ اور وہ مذہبی نقطۂ نظر سے کتنی اہمیت کا حامل ہے''۔۶؎

تفسیر قرآن محی الدین ابن عربی کی ان اہم تصنیفات میں ہے جن سے ان کی جلالت علمی کے ساتھ وجود خداوندی اور کائنات سے متعلق ان کے مخصوص فکر کی نمائندگی ہوتی ہے۔ راقم کے پیش نظر المطبعۃ المیمنیۃ، مصر سے طبع شدہ وہ نسخہ ہے جو مصطفی البابی اور ان کے بھائیوں کے فراخ دلانہ تعاون سے زیور طبع سے آراستہ ہوا اور 'تفسیر الشیخ الاکبر' کے نام سے معروف ہے۔ یہ دو اجزاء میں ہے، جو ایک ہی جلد میں یکجا ہیں۔ پہلے جزء میں سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف تک کی تفسیر کی گئی ہے، جب کہ دوسر جزء سورۂ مریم تا سورۃ الناس پر مشتمل ہے۔ چوں کہ شیخ نے ہر آیت کی تفسیر نہیں لکھی ہے، اس لیے حاشیے میں زیر بحث آیت یا اس کے مخصوص حصے کے علاوہ دیگر آیتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔ اس طرح پورا قرآن ان دونوں اجزاء کے حاشیے میں رقم ہے۔ آغاز میں شیخ اکبرؒ نے ایک مختصر مگر جامع تمہیدی گفتگو کی ہے، جس سے ان کی اس علمی کاوش کے مضمرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں شیخ کے اس مقدمۂ تفسیر کے بعض اہم مشتملات کو بالاختصار حوالۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ان سے شیخ کی اس قرآنی خدمت کے بعض نکات سامنے آتے ہیں۔

شیخ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وستائش کے بعد تلاوت قرآن مجید اور اس کے معانی ومفاہیم کے تدبر وتفکر پر التزام کی ذاتی حلاوت، طمانینت قلب اور شرح صدر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر آیت کے اسرار ورموز عاجز پر اس حد تک واضح اور مبرہن ہو گئے کہ زبان شایان شان تحدیث نعمت سے قاصر ہے۔ فرماتے ہیں:

''فانی کلّما تَعَهَّدْتُ تلاوة القرآن وتدبرتُ معانیها بقوة الإیمان وکنت مع المُواظِبةِ علی الأوراد حرج الصدر، قَلَق الفؤادُ، لاینشَرِحُ بها قلبی ولا یَصْرِفُنی عنها رَبّی، حتی استأنستُ بها فالِفْتُها

و ذُقْت حَلاوَۃَ کأسھا و شربتُھا ، فاذا أنا بھا نشیطُ النفس فَلَجَ الصدر متّسعَ البالِ مُنبِسَط القلبِ فسیحَ السُّر طِیِّبَ الوقتُ و الحالُ مسرور الروح بذلک الفتوح ۔ ۷؎

''پس میں نے جب بھی قرآن مجید کی تلاوت کی اور اس کے معانی و مطالب پر ایمان کی قوت سے غور وفکر کیا (حالاں کہ میں اوراد میں التزام کی روش پر تھا) تو سینے میں تنگی محسوس ہوتی تھی، دل مضطرب رہتا تھا اور اس کے ذریعہ میرے قلب کو انشراح حاصل نہیں ہوتا تھا اور نہ میرا رب اس کی تلاوت سے مجھے پھیرتا تھا، یہاں تک کہ میں اس سے مانوس ہو گیا اور اس کی محبت دل میں بیٹھ گئی، اس کے جام کی حلاوت کا ذائقہ لیا اور اسے پیا۔ چنانچہ اس کے ذریعہ میں چاق وچوبند ہو گیا۔ پس سینہ مطلوب پر فتح مند ہوا، اس حال میں کہ وہ آسودہ اور دل کشادہ تھا۔ چنانچہ خوشی دوبالا ہوگئی، وقت خوش گوار ہوا اور حالت یہ تھی کہ روح کو ان فتوحات کے سبب سرور حاصل ہوا''۔

شیخ ابن عربی کے ان تمہیدی کلمات کی روشنی میں آیات قرآنی کے بارے میں ایک اور موقف سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ ہر آیت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن اور ہر حرف کے لیے ایک حد ہوتی ہے اور ایک مطلع (بلند ہونے کی جگہ)۔ شیخ اس موقف کے بارے میں گفتگو کا سلسلہ دراز رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ظاہر سے مراد تفسیر اور باطن سے مراد تاویل ہے۔ حد اس کو کہتے ہیں جہاں فہم ودانش کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور مطلع وہ ہے جس تک اس سے بلند ہوا جاتا ہو۔ یہاں تک کہ وہ پھر سب سے بڑے جاننے والے بادشاہ حقیقی سے واقف ہوتا ہے''۔ ۸؎

غالباً تفسیر وتاویل سے شیخ کی مراد اس نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ تفسیر کا تعلق ظاہر کلام سے ہے اور تاویل کا تعلق اس کلام سے مترشح ہونے والے معانی ومفاہیم سے ہوتا ہے۔ شیخ اپنے تفسیری منہج کا تذکرہ کرتے ہوئے مخاطبین کو یہ گوش

گزار کراتے ہیں کہ انھوں نے تاویل کے پہلو کو اختیار کیا ہے اس لیے کہ اس کے ساکت اور منجمد نتائج نہیں رہتے، بلکہ سننے والے کے احوال اور سلوک کی راہ اختیار کرنے والے کے مراتب کے لحاظ سے ان کے اندر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ تفسیر بالرآی کے کفر تک لے جانے کے سنگین پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اپنی اس علمی کاوش میں تاویل کے طریقہ پر گام زن رہتے ہیں۔

اپنے ایک اور تفسیری منہج کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ فرماتے ہیں کہ ''وہ آیتیں، جن کی تاویل میرے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، یا جن آیتوں کی تاویل کی ضرورت نہیں ہے، ان پر گفتگو کرنے سے میں نے احتراز کیا ہے''۔۹؎

شیخ ابن عربی مفہوم آیات کی وضاحت میں دوسرے مفسرین کی آراء یا تاویلات ذکر کرنے سے عموماً اجتناب کرتے ہیں اور جس آیت کے بارے میں خود توضیحی کلمات فرماتے ہیں یا کوئی تاویل کرتے ہیں، ان کے سلسلے میں ادّعائی انداز سے گریز کرتے ہیں۔ مقدمۂ تفسیر میں کلامِ الٰہی کے بحر ناپیدا کنار ہونے کی حقیقت، عقل کی نارسائی اور اپنے عجز وانکساری کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

و لا ازْعَمُ اَنّی بَلَغْتُ الحدّفیما أوْرَدْتُه کُلاًّفَاِنّ وجوہ الفهم لاتنحَصِرُ فِیما فهِمتُ وعلمُ الله لا یتقَیّد بما عَلِمْت ، ولِلّٰه تعالی فی کلِ کَلمَةٍ کلماتٌ ینفَدُ ا البحر دون نفادها فکیف السبیلُ الی حَصْرِها وَتَعْدادِها''۔۱۰؎

''مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے جن موضوعات سے بھی بحث کی ہے، ان کی انتہا تک پہنچ گیا ہوں، کیوں کہ فہم وادراک کی جہتوں کا انحصار میرے فہم پر نہیں ہے اور اللہ کا علم، جو میں جانتا ہوں، اس سے مقید نہیں ہے۔ اللہ کے ہر کلمہ میں ایسے کلمات مضمر ہیں کہ سمندر (کا پانی) ان کے ختم ہونے سے پہلے ختم ہوجائے''۔

قرآن کریم کے تراجم وتفاسیر میں عام طور پر افراد یا جماعتوں کے مخصوص

فکر ومسلک کی ترجمانی ایک معروف بات ہے۔ شیخ ابن عربی بھی قرآنی آیات کی تفسیر وتوضیح میں اپنا دامن اپنے مخصوص میلان طبع بلکہ مخصوص فکر کی شمولیت اور اس پر اصرار سے نہیں بچا سکے ہیں۔ چنانچہ متعدد آیات کریمہ میں ان کا صوفیانہ فکر غالب نظر آتا ہے۔ وفلسفۂ وحدۃ الوجود کے شارح ہیں، اس لیے ان آیات میں، جہاں اللہ کی ہستی کے غیر فانی اور ہمیشہ قائم ودائر رہنے کا ذکر ہے، توحید وجودی کا مخصوص فلسفہ پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ بسا اوقات قرآن مجید کے ظاہری الفاظ یا اس کا سیاق وسباق شیخ کی تفسیر وتأویل کا ساتھ نہیں دیتے۔

شیخ کے بعض تفردات، رجحانات اور مخصوص فلسفہ وفکر کے تعارف وتجزیے کے لیے ذیل میں ان کی تفسیر سے کچھ مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اهدنا الصراط المستقيم۔ صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين۔ (الفاتحة: ٦۔٧)

ان آیات میں 'الصراط المستقیم' سے مراد بعض اہل تفسیر نے الطریق الحق یا ملت اسلامیہ کا راستہ لیا ہے۔ ۱۱؎ بعض نے اسے اس راستے سے تعبیر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے کھولا گیا ہے اور جو دین ودنیا دونوں کی فلاح وسعادت کا ضامن ہے۔ ۱۲؎ بعض نے اس سے فلاح دارین کا موجب اور دنیا کی الجھنوں کے رفع وازالہ میں نسخۂ اکسیر ثابت ہونے والا راستہ مراد لیا ہے۔ ۱۳؎ بعض نے اسے اللہ کے منظور نظر بندوں کا راستہ قرار دیا ہے۔ ۱۴؎ الشیخ الاکبر نے اسے ہدایت پر ثابت قدم رکھنے اور توحید کے راستے پر استقامت بخشنے سے تعبیر کیا ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

''یہی وہ راستہ ہے جو منعم حقیقی کا راستہ ہے، جس نے اپنی مخصوص نعمت: معرفت، محبت، ہدایت اور حقانیت سے سرفراز فرمایا، یہی وہ طریقہ ہے جس پر انبیائ، شہداء، صدیقین اور اولیاء عامل رہے، بلکہ

ہمہ آں اور ہمہ وقت انھوں نے اسے حرزِ جان بنائے رکھا۔۱۵؎

اگرچہ 'صراط الذین انعمت علیھم' میں نعمت کی جامع تعبیر شریعت یا دین اسلام سے ہوسکتی ہے، جیسا کہ بالعموم مفسرین کی رائے ہے، تاہم 'الصراط المستقیم' کے لیے طریقۃ الوحدۃ یا طریقۃ التوحید جو تعبیر ابن عربی نے اختیار کی ہے وہ اس لحاظ سے مہتم بالشان ہے کہ دین کی اصل بنیاد توحید ہے، یا یوں کہا جائے کہ جب تک توحید کا عقیدہ نہ، ہو بڑے سے بڑے اعمال بھی خس وخاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، بلکہ توحید کے بغیر ان اعمال کی حیثیت آخرت میں صحرا کے سراب کی سی ہوگی۔۱۶؎ 'صراط مستقیم' سے متعلق ابن عربی کی اس تاویل میں اگرچہ ان کے مخصوص فلسفہ وحدۃ الوجود کی جھلک ملتی ہے، تاہم یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ توحید کا راستہ ہی دراصل تمام خداؤں سے رشتہ منقطع کرا کے خدائے واحد کا پرستار بناتا ہے اور اس طرح انسان اس دنیا میں مخدوم کائنات بن کر شرف وعظمت کی بلندیوں پر کمندیں ڈالتا ہے اور دوسری طرف وہ آخرت کی لازوال مسرتوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔

آیت بالا کے آخری حصے 'غیر المغضوب علیھم ولا الضالین' کی تاویل بھی شیخ ابن عربی نے بڑی دل چسپ کی ہے۔ عام طور پر مفسرین نے 'غیر المغضوب علیھم' سے یہود کو اور 'ولا الضالین' سے نصاری کو مراد لیا ہے۔۱۷؎ اس آیت کی تاویل میں شیخ کا مخصوص فکر نمایاں ہے۔ انھوں نے ان دونوں جماعتوں کے معتوب اور گم گشتہ راہ ہونے سے متعلق یہ توجیہ کی ہے:

''غیر المغضوب علیھم، الذین وقفوا مع الظاھر واحتجبوا بالنعمۃ الرحمانیۃِ والنعیمِ الجسمانی والذوق الحِسّی عن الحقائقِ الروحانِیۃ والنعیم القلبی والذوق العقلی کالیھود، اِذ کانت دعوتُھم الی الظواھرِ والجِنان، والحُور والقصور، فغضب علیھم لأن الغضب یستلزم الطَرد والبُعد والوقوف مع الظواھر التی ھی الحُجُب الظُلمانیۃ غایۃ البعد و''لا الضالین'' الذین وَقَفُوا مع

البواطن التی هی الحُجب النورانیة واحتجبوا بالنعمة الرّحیمیة عن الرّحمانیة وغَفَلوا عن ظاهریة الحق وضَلّوا عن سواء السبیلِ فحَرّموا شهود جمالِ المحبوب فی الکل کالنصاری اذ کانت دعوتهم الی البواطن وانوار عالم القدوس۔ ۱۷؎

''المغضوب علیهم' وہ لوگ ہیں جو ظاہری چیزوں پر قائم رہے اور رحمانی نعمت، جسمانی لذت اور حسی ذوق کی وجہ سے روحانی حقائق، قلبی نعمت اور ذوق عقلی سے گریزاں رہے، جیسے یہود، کیوں کہ ان کی دعوت ظاہری چیزوں، باغات، حوروں اور محلات کی طرف تھی، پس ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا، کیوں کہ غضب، برترفی، انتہائی اور بعد کو مستلزم ہے اور ظاہری چیزوں سے وابستگی کو مستزلم ہے، تاریک پردے ہیں اور 'الضالین' وہ لوگ ہیں جو باطنی چیزوں پر قائم رہے، جو نورانی پردے ہیں۔ یہ لوگ نعمت رحیمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رحمانی نعمتوں سے گریزاں رہے اور حق کی ظاہری چیزوں سے غافل رہے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ پس انھوں نے ہر شکل میں محبوب کے جمال کے مشاہدے کو حرام قرار دیا، جیسے کہ نصاری، کیوں کہ ان کی دعوت باطن اور عالم قدوسی کے انوار کی طرف تھی''۔

سورۃ المنافقون کی پہلی آیت ہے: **واللہ یشهد ان المنٰفقین لکٰذبون** 'اور اللہ گواہ ہے کہ منافقین بالیقین جھوٹے ہیں'۔

اس آیت میں منافقین کی ایک خصلت یہ بتائی گئی ہے کہ یہ لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ اور ایسا طرزِ عمل اللہ کو بہت ہی ناپسند ہے۔ (الصّف:۲) بعض دوسری خصلتیں اس کے ذیل میں یہ ہیں کہ وہ ایمان والوں کو اپنی دانست میں دھوکہ دیتے ہیں، وہ مفادات کے بندے ہوتے ہیں، کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لیتے، سازگار اور خوش گوار حالات میں وہ اسلام کا علم اٹھاتے ہیں اور ناخوش گوار حالات میں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ (البقرۃ:۹-۲۰) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

کہ ان کا عمل ان کے قول کے مطابق نہ ہونے کی بنا پر یا قلب سے اعتقاد کے بجائے محض زبانی گواہی دینے کی بنا پر وہ جھوٹے ہیں۔

'المنافقین' کی تشریح وتوضیح میں شیخ ابن عربی کے پیش نظر غالباً وہ آیت کریمہ ہے، جس میں منافقین کے تردد تذبذب کا تذکرہ 'مذبذبین بین ذلک لا الی ھولاء ولا الی ھولائ' کے الفاظ میں ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے 'متذبذبین' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ منافقین کے اندر اصل اور فطری صلاحیت تو نور ایمان کی طرف کھینچنے والی ہوتی ہے، لیکن ان کی عاداتِ شنیعہ اور خصائص رذیلہ کی افزائش کی بنا پر پیدا ہونے والی عارضی صلاحیت انھیں کفر کی طرف کھینچتی ہے اور رسالت کی شہادت میں یہ جھوٹے ہیں، اس لیے کہ رسالت کے معنی کی حقیقت اللہ اور علم میں پختہ کار لوگ ہی جانتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ کو اور اس کے ذریعہ رسول کو جانتے ہیں۔ اس لیے کہ رسول کی معرفت اللہ کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں۔

وحدۃ الوجودی فکر وفلسفہ کے علم بردار اور نقیب ہونے کے باوجود شیخ ابن عربی عام صوفیوں کی طرح محض باطنیت کے علم بردار نہیں تھے، بلکہ ظاہر کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ وہ اللہ کی معرفت کے لیے شریعت پر عمل پیرا ہونے کو بھی جز لاینفک کی حیثیت دیتے تھے۔

ادارتی نوٹ

اس مضمون میں شیخ ابن عربی کی تفسیر کا بہت اجمالی تعارف کرایا گیا ہے اور جو چند مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے اس کے مشتملات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس تفسیر کے تعارف وتجزیہ پر مشتمل ایک مبسوط مقالہ مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے ماہ نامہ زندگی رام پور (نومبر ۱۹۸۳ئ) میں لکھا تھا۔ افادیت کے پیش نظر اس کے چند اقتباسات ذیل میں پیش خدمت ہیں:

"بعض محققین نے اس کتاب کے بارے میں دو باتیں لکھی ہیں: ایک یہ کہ

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی طرف اس کتاب کا انتساب غلط ہے۔ یہ کمال الدین کاشی کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ تفسیر قرآن نہیں ، بلکہ بہت سی آیات قرآن کی تاؤیل ہے۔ یہ دوسری بات خود مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے۔

''پہلی بات کے بارے میں اس حقیر نے خود کوئی تحقیق نہیں کی ہے۔ یوں بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ تاؤیلات کے پردے میں جو فلسفیانہ تصوف اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ شیخ اکبر کی مسلمہ کتابوں فصوص الحکم اور الفتوحات المکیہ میں موجود ہے''۔

''دیباچہ میں مصنف نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کی تفسیر بالرأی پر جو وعید آئی ہے، اس کا تعلق قرآن کے ظاہر یعنی اس کی تفسیر سے ہے، قرآن کے باطنی یعنی اس کی تاؤیل نہیں۔۔۔یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ۔۔۔قرآن کریم کی تفسیر بالرأی پر جو وعید آئی ہے وہ بدرجۂ اولیٰ گم راہ کن تاؤیلات پر بھی صادق آتی ہے''۔

''یا ایھا الذین آمنو اور الذین آمنو کے جملہ قرآن میں بہت آئے ہیں۔ مصنف ایمان کی من گھڑت تقسیم کے اعتبار سے ان آیات میں کہیں ایمان علمی لکھ دیتے ہیں ، کہیں ایمان عینی اور کہیں ایمان حقی۔ جنت کو انھوں نے تین قسموں میں بانٹ دیا ہے: جنت افعال، جنت صفات اور جنت ذات۔حور و قصور والی جنت کو وہ جنت افعال قرار دیتے ہیں، جو ان کے خیال میں گھٹیا درجہ کی جنت ہے، وہ 'رضوان اللہ' کو جنت صفات کہتے ہیں۔ باقی رہی جنت ذات تو معلوم نہیں وہ کیا چیز ہے؟۔۔۔یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جنت کی اس تقسیم کا کہیں کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔

''و النصرنا علی القوم الکافرین' (البقرۃ:۲۵) میں انھوں نے 'القوم الکافرین' سے نفوس امارہ اور اوہام وخرافات مراد لیا ہے۔۔یہ عربی زبان

کا مذاق اڑانا ہے ۔ وحدۃ الوجود کے وہم نے صوفیہ کو کتنے گہرے گڈھے میں گرادیا ہے۔

''اس کتاب میں صرف یہی نہیں کیا گیا ہے کہ 'تاویل' کے نام سے فلسفیانہ تصوف کے نظریات و خیالات زبردستی اس میں داخل کیے گئے ہیں۔ بلکہ الفاظ قرآن کے ساتھ بھی کھلی ہوئی زیادتیاں کی گئی ہیں۔ حد یہ ہے کہ قیامت کے جو اسماء صفات قرآن میں ہیں، ان کے معنیٰ و مراد کو بھی بدل دیا گیا ہے، مؤلف کتاب نے قیامت کی بھی دو قسمیں کر دی ہیں: قیامت کبریٰ، قیامت صغریٰ۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جس یوم الحساب اور یوم الدین کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ مؤلف کے نزدیک قیامت صغریٰ (چھوٹی قیامت) ہے۔ پھر قیامت کبریٰ کیا ہے؟ وہ ہے سالک راہ عشق کا مقام فنا پر پہنچ جانا اور فنا فی اللہ ہو جانا۔

''اس کتاب کے مرتب نے پورے قرآن کو اپنے من گھڑت فلسفہ کا تختۂ مشق بناڈالا ہے''۔

یہ مقالہ مولانا مرحوم کی کتاب 'تصوف اور اہل تصوف' میں شامل ہے۔ (ص ۲۸۱۔ ۳۰۲) تفصیل کے طالب اس سے رجوع کر سکتے ہیں۔ (رضی الاسلام)

حواشی و مراجع

(۱) The Encyclopaedia of Islam, P. 708 (New Edition) 1971, E.J. Leiden

(۲) Joseph W. Meri (Editor): Medieval Islamic Civilization - An Encyclopaedia, vol. 1, p. 349. New York, London

(۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۱، ص: ۶۰۷، طبع اول، ۱۹۸۰ئ، لاہور

(۴) ابوالعلاء العفیفی کا مضمون 'ابن العربی' اردو دائرہ معارف اسلامیہ، اردو دانش گاہ

پنجاب، لاہور، طبع اول ۱۹۶۴ء، ص: ۶۰۶

(۵) ابراہیم بن عبداللہ القاری البغدادی: مناقب ابن عربی (تحقیق الدکتور صلاح الدین المنجد)، بیروت، ۱۹۵۹ء

(۶) ملاحظہ کیجیے: ابوالعلاء العفیفی کا مضمون 'ابن عربی'، ص: ۶۰۸

(۷) ملاحظہ فرمائیے: تفسیر الشیخ الاکبر، المطبعۃ المیمنیہ، مصر، مقدمۃ، ص: ۳۔

(۸) حوالۂ سابق، ص: ۳

(۹) حوالۂ سابق، ص: ۳

(۱۰) حوالۂ سابق، ص: ۳

(۱۱) الزمخشری: الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، دارالکتاب العربی، بیروت، لبنان، الجزء الاول ص: ۱۵

(۱۲) امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، طبع اول، ۱۹۸۹ئ، تاج کمپنی لاہور، ج: اول، ص: ۵۹،

(۱۳) مفتی محمد شفیع: معارف القرآن، ، ادارۃ الطباعۃ والمصطفائیۃ، دیوبند، ج: ۱، ص: ۹۱،

(۱۴) ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن،، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۲۰۰۰ ج: ۱، ص: ۵۴، طبع سوم،

(۱۵) ابن عربی: تفسیر الشیخ الاکبر، ص: ۵

(۱۶) مثلاً ملاحظہ فرمائیے: الزمخشری، الکشاف، ج: ۱، ص: ۱۸، مفتی محمد شفیع: معارف القرآن، ج: ۱، ص: ۹۹، ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن، ج: ۱، ص: ۵۴۔

(۱۷) تفسیر الشیخ الاکبر، ج: ۱، ص: ۵

☆☆☆

اکیسویں صدی کے سماجی مسائل
اور
اسلام

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اکیسویں صدی عیسوی میں جہاں سائنسی ایجادات اور تمدنی ترقیات کے نتیجے میں سفر و حضر کی سہولیات پیدا ہوئی ہیں اور انسانی زندگی پرتعیش ہوئی ہے، وہیں بہت سے ایسے سماجی اور اخلاقی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن سے دنیا فتنہ وفساد سے بھر گئی ہے۔ نکاح کے بغیر جنسی تعلق، جنسی بے راہ روی وزنا کاری، رحم مادر کا اجرت پر حصول، ہم جنسیت، مصنوعی طریقہ ہائے تولید، اسپرم بینک، رحم مادر میں بچیوں کا قتل، گھریلو تشدد، اولڈ ایج ہوم، پلاسٹک سرجری اور عام تباہی کے اسلحہ کا استعمال، چند ایسے اہم مسائل ہیں جن سے انسانی معاشرے عالمی سطح پر دوچار ہیں۔

اس کتاب میں ان مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، ان کے اسباب و اثرات ونتائج کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

جدید ترین مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے والی ایک تحقیقی کتاب۔

● سائز: $\frac{23 \times 36}{16}$ ● صفحات: 256 ● قیمت: 140.00

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone: 26971652, 26954341, 26946447(D) Fax: 26947858
E-mail: mmipublishers@gmail.com • **Website:** www.mmipublishers.net

تعارف وتبصرہ

محمد ﷺ۔عصر حاضر کے پیغمبر مصنفہ: کیرن آرم اسٹرانگ

مترجمین: نعیم احمد غازی، سید عبید الرحمن

ناشر: گلوبل میڈیا پبلی کیشنز، E-42، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، ص:۲۲۰، قیمت۔/۱۹۵

موجودہ دور میں، جب کہ عالمی سطح پر اور خاص طور سے مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید بغض ونفرت کا اظہار کیا جارہا ہے، اسلام کو تشدد کا علم بردار اور پیغمبر اسلام ﷺ کو نعوذ باللہ دہشت گرد بتایا جارہا ہے اور نفرت انگیز کارٹونوں کی مہم چھڑی ہوئی ہے، کسی مغربی دانش ور کے قلم سے ایسی کتاب سامنے آتی ہے جس میں معروضی انداز میں اسلام کا تعارف کرایا گیا ہو اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کو بہت مثبت انداز میں عقیدت کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہو تو بڑی مسرت و فرحت کا احساس ہوتا ہے اور دل ودماغ کو ٹھنڈک اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب کا مطالعہ کر کے ایسا ہی احساس ہوا۔

کیرن آرم اسٹرانگ (Keran Armstrong)[ولادت ۱۹۴۴ئ] ایک برطانوی عیسائی خاتون ہیں۔ ان کا شمار دور حاضر میں 'تقابلِ ادیان' کے موضوع پر عالمی شہریت کے حامل اہم مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کی چند اہم تصنیفات یہ ہیں:

(1) A History of God: The 4000 year Quest of Judaism, christianity and Islam (2) Field of blood: Religion and History of Voilence (3) Holy War: The Crusade and their Impact (4) Islam: A Short History oof Today's World.

موصوفہ ان چند مغربی مصنفین میں سے ہیں جنھوں نے مثبت انداز میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ایک کتاب ۱۹۹۱ء میں Mohammad: A Biography Of the Prophet کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ 9/11 کے حادثے کے بعد انھیں احساس ہوا ہے کہ اس موضوع کے بعض دوسرے

پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک دوسری کتاب Mohammad: Prophet For Our Time لکھی، جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ زیرنظر کتاب اسی کا ترجمہ ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے: مکہ، جاہلیہ، ہجرت، جہاد اور سلامتی۔ فاضل مصنفہ نے زمانی ترتیب سے سیرتِ نبوی پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے، خاص طور سے ان موضوعات پر عمدہ بحث کی ہے جن کو مغرب میں تنقید وجرح کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جن مسائل پر مسلم علماء اور اسکالر دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان پر بھی انھوں نے پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے اور اسلام کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کے اعمال اور رویّوں کا دفاع کیا ہے۔

اپنے پیش لفظ میں مصنفہ نے مغرب میں اسلام مخالف رجحان پر نقد کیا ہے۔ لکھتی ہیں: ''ہمارے اپنے مغربی معاشرہ میں اسلام مخالف جذبات نئے نہیں ہیں۔ ان کی بنیاد تقریباً آٹھ سو سال پہلے کی صلیبی جنگوں کے دوران پڑی، بارہویں صدی عیسوی میں عیسائی مذہبی رہ نماؤں نے یہ پروپگنڈہ بڑے پیمانے پر کیا کہ اسلام ایک متشدد مذہب ہے اور صرف تلوار کے زور پر اس کو زبردستی لادد یا گیا ہے۔ انھوں نے لوگوں کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ محمد ﷺ (نعوذ باللہ) ایک جھوٹے نبی ہیں، جنھوں نے زبردستی اپنے مذہب کو طاقت کے زور سے لوگوں پر لادد یا ہے''۔ (ص ۱۴)

اس معاملہ میں انھوں نے اپنا فیصلہ صاف الفاظ میں سناتے ہوئے مطالعہ کی صحیح جہت کی طرف رہ نمائی کی ہے۔ لکھتی ہیں: ''حضرت محمدؐ جنگجوئیت اور تشدد کے حامی نہیں تھے۔ ہمیں ان کی زندگی مطالعہ متوازن انداز میں کرنا پڑے گا، تبھی آپؐ کی بے شمار کامیابیوں اور امتیازات کو ہم قدردانی کی نظر سے دیکھ سکیں گے۔ تعصب اور بدگمانی پر مبنی نقطۂ نظر اس تحمل، رواداری، آزادی اور محبت کے لیے ضرر رساں ثابت ہوسکتا ہے، جس کے لیے مغرب کو آج جانا جاتا ہے''۔ (ص ۵)

موجودہ دور میں لفظ 'جہاد' کو دہشت گردی اور خوں آشامی کے ہم معنیٰ بنا دیا گیا ہے۔ کان میں یہ لفظ پڑتے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور نفرت و کراہیت ہونے لگتی ہے۔ مصنفہ اس کا صحیح مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں: ''اس لفظ کو، جسے ہم آج کل عموماً سنتے ہیں، اس کا بنیادی معنیٰ 'مقدس جنگ' نہیں، بلکہ کوشش کرنا اور جدوجہد کرنا ہے۔ یہ کوشش اور جدوجہد صرف اس لیے کہ خدا کی مرضی کا نفاذ ہوجائے۔ مسلمانوں کو اس مقصد کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں انٹلکچول، سماجی، معاشی، روحانی اور گھریلو ہر طرح کی کوششیں شامل ہیں۔ کبھی کبھی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں ان کو لڑنا بھی پڑسکتا ہے۔ لیکن یہی بنیادی کام نہیں ہے''۔ (ص ۱۲۹)

سیرتِ نبوی ﷺ پر جو کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں ان میں 'مغازی' کا باب بہت طویل اور نمایاں رہا ہے۔ اس بنا پر حیاتِ رسول ﷺ کی غیر متوازن تصویر سامنے آتی ہے۔ مصنفہ نے اس پہلو پر اچھی بحث کی ہے۔ انھوں نے اسلام کے نظریۂ جنگ کی بالکل صحیح ترجمانی کی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے: ''قرآن میں خود حفاظتی جنگ کی تو اجازت ہے، کیوں کہ اس کے بغیر اس نئے دین کو دشمن ختم کرنے کے درپے تھے، لیکن دوسروں کو کچلنے کے لیے جنگ کی شروعات کرنے کی اسلام نے مذمت کی ہے۔ جنگ ایک خوف ناک برائی ہے، لیکن بعض حالات میں یہ ضرورت بن جاتی ہے۔ آزادیٔ مذہب کے حصول کے لیے اس کی اہمیت اپنی جگہ ناگزیر ہے، لیکن اس موقع پر بھی اسلام نے تکثیریت کو نظر انداز نہیں کیا، اس نے صاف صاف کہا کہ معبد اور گرجا گھروں کی کسی بھی قیمت پر حفاظت کرنی ہوگی''۔ (ص ۱۲۰۔۱۲۱)

نبوی غزوات وسرایا میں 'غزوۂ بنی قریظہ' کو بعض پہلوؤں سے بہت ابھار کر پیش کیا گیا ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر یہودی قبیلہ بنو قریظہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں سے غدّاری کر کے ان کے دشمنوں سے جا ملے، چنانچہ احزاب سے فراغت پانے کے بعد ان پر فوج کشی کی گئی اور ان کے تمام جنگ جو افراد کو قتل کر دیا گیا۔ مغربی مصنفین اس واقعہ کو بہت بھیانک بنا کر پیش کرتے ہیں، لیکن مصنفہ نے اس

کے تذکرہ میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ لکھتی ہیں: ''عصر حاضر میں یہ ہمیں چاہے کتنا نفرت انگیز کیوں نہ لگے، لیکن اس زمانے کے عرب میں تقریباً ہر ایک کو اسی فیصلہ کی توقع تھی۔ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ قریظہ کو بھی اس فیصلہ پر حیرت نہیں ہوئی... یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قریظہ کو مذہبی یا قومی وجوہ کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا۔ کسی دوسرے یہودی قبیلہ نے نہ تو اس پر اعتراض جتایا اور نہ مداخلت کی۔ ان سب کو یہ ایک سیاسی فیصلہ لگا.... قریظہ کے یہودیوں کو غداری کے جرم میں مارا گیا تھا۔ دوسرے سترہ (۱۷) یہودی قبائل اب بھی مدینہ کے نخلستان میں آباد تھے۔ قریظہ کی تباہی کے بعد بھی یہ قبائل سالہا سال تک مدینہ میں رہتے رہے... مستقبل کی اسلامی حکومتوں میں بھی یہودی مستقلاً مکمل آزادی کے حق دار رہے۔ یہودی مخالفت اور یہودیوں سے دشمنی کبھی بھی اسلام کا حصہ نہیں تھی۔ (ص ۱۵۴)

'حقوق نسواں' مصنفہ کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس پر لکھتے ہوئے ان کے قلم میں روانی آجاتی ہے۔ (ص ۳۸۔۵۰) وہ عورتوں پر اسلام کے احسانات بیان کرتے ہوئے بہت پرجوش ہو جاتی ہیں۔ لکھتی ہیں: '' قرآن معاشرہ میں خواتین کو وہ حقوق دینے کی کوشش کر رہا تھا جو مغرب میں خواتین کو انیسویں صدی تک بھی حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ عورتوں کی آزادی ایک ایسا موضوع تھا جو کہ رسالت مآبؐ کو بہت عزیز تھا...'' (ص ۱۴۰) ''اب عورتوں کو معاشی آسودگی اور اطمینان بھی میسر آ گیا... ساتویں صدی کے عرب میں یہ ایسی جدت طرازی تھی جس پر یقین کرنا اس زمانے میں ہی نہیں، بلکہ بعد میں بھی دوسرے علاقوں میں مشکل تھا۔'' (ص ۱۴۸)

اسلام پر اعتراض کرنے والوں نے اس میں تعدّد ازدواج کی اجازت کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے جواب میں علماء اسلام کا انداز عموماً مدافعانہ ہو جاتا ہے۔ مصنفہ نے، اس موضوع پر اسلام کے نقطۂ نظر کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ لکھا ہے: ''ناقدین نے تعدّد ازدواج کو مسلم خواتین کی حالتِ زار کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی ہے، لیکن جس وقت یہ وحی نازل ہو رہی تھی، اس وقت یہ اپنے وقت سے آگے کی چیز تھی۔

تعدد ازدواج کی اجازت ایک عظیم الشان سماجی قانون سازی کا حصہ تھی۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ مردوں کی نہ ختم ہونے والی جنسی ضرورتوں کی تکمیل ہوسکے، بلکہ اس لیے تاکہ اس ناانصافی کو ختم کیا جاسکے جو کہ بیواؤں، یتیموں اور دوسری خواتین کے حصے میں آتی تھی... تعدد ازدواج کی اجازت اس لیے دی گئی کہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ ایسی بے سہارا عورتوں کو بھی ازدواجی زندگی کی مسرتیں مل سکیں اور ان کو سہارا دیا جاسکے۔'' (ص ۱۳۸۔۱۳۹)

کتب احادیث وسیرت میں بیان کیا گیا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کا نکاح چھ (۶) سال کی عمر میں اور رخصتی نو (۹) سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس پر اعتراض کی شدت کو محسوس کر کے موجودہ دور کے بعض مسلم دانش وروں نے چھ (۶) کو سولہ (۱۶) بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس موضوع پر مصنفہ کی بحث عمدہ ہے۔ انھوں نے وقتِ نکاح ان کی عمر چھ سال (۶) سال مانی ہے، پھر لکھا ہے: ''اللہ کے رسول ﷺ اور ان کی ازواجِ مطہرات کے بارے میں مغرب نے بہت سی فحش باتیں مشہور کر رکھی ہیں، لیکن عرب، جہاں تعدد ازدواج کا عام رواج تھا، یہ ایک عام بات تھی... محمدؐ کی عائشہؓ سے منگنی میں کوئی غیر معقولیت نہیں تھی۔ خاندان اور قبائلی تعلقات کو بہتر بنانے کی خاطر یہ شادیاں معاہدوں کی مانند ہوا کرتی تھیں اور بسا اوقات لڑکیاں عائشہؓ سے بھی کم عمر ہوا کرتی تھیں، بلکہ یورپ میں تو یہ رواج جدید زمانہ تک موجود تھا۔ اس کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ عائشہؓ کی رخصتی ان کی بلوغت سے پہلے ہوجائے۔ عام لڑکیوں کی ہی طرح ہی ان کی رخصتی بلوغت کے فوراً بعد کر دی گئی، جو اس زمانے میں ایک عام بات تھی۔'' (ص۹۹)

بہ حیثیت مجموعی کتاب کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مصنفہ کے بہت سے بیانات صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً ہجرتِ مدینہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے قریش کے تجارتی قافلوں کی خبر گیری کے لیے جو 'سرایا' بھیجے تھے ان کا تذکرہ انہوں نے اس انداز میں کیا ہے کہ ان کے ذریعہ لوٹ مار کی گئی، جس سے مسلمانوں کی معیشت مضبوط ہوئی (ص۱۱۹) پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اپنی کتاب 'غزواتِ نبوی کی

اقتصادی جہات' میں اس بات کا مدلّل جواب دیا ہے۔'الغرانیق العلیٰ' والے مشہورِ عام واقعہ کے ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''مشرکانہ الفاظ حضورؐ کی زبان پر جاری ہو گئے تھے، بعد میں جبرئیلؑ نے آ کر تنبیہ کی'' (ص ۶۶۔۶۷) یہ واقعہ اگر چہ کتبِ سیرت میں ملتا ہے، لیکن محققین کے نزدیک اس کی بیش تر تفصیلات من گھڑت ہیں۔ امہات المومنین کے انھوں نے دو گروپ قرار دیے ہیں: ایک اعلیٰ طبقہ، جس کی قیادت حضرت ام سلمہؓ کر رہی تھیں اور دوسرا متوسط طبقہ، جس میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ وغیرہ تھیں۔ ان کے مطابق ان گروپوں میں کش مکش ہوتی رہتی تھی۔ یہ بیان حقیقتِ واقعہ سے میل نہیں کھاتا۔ فتحِ مکہ کے ضمن میں وہ بیان کرتی ہیں کہ 'خانۂ کعبہ کے اندر حضرت عیسیٰؑ اور مریم کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے انہیں صاف کرنے سے منع کر دیا۔'' (ص ۱۸۸) حالاں کہ کتبِ حدیث و سیرت میں صراحت ہے کہ آپؐ نے انہیں مٹوا دیا تھا۔ جس سفر میں صلحِ حدیبیہ ہوئی تھی اس کے تذکرہ میں وہ بار بار لکھتی ہیں کہ ''آپؐ حج کے ارادے سے نکلے تھے۔'' (ص ۱۶۴۔۱۶۵) حالاں کہ اس میں آپؐ نے عمرہ کا قصد کیا تھا۔ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہؓ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ قبیلۂ عامر کے سردار کی بیٹی تھیں۔ ان کے شوہر غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے۔ اس سردار کا نام ابو براء لکھا ہے اور اسے حضور کا خسر بتایا ہے۔ (ص ۱۴۰۔۱۴۱) یہ سب باتیں غلط ہیں۔ حضرت زینبؓ کے شوہر غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے۔ کتبِ سیرت میں عثمان بن طلحہ (کلیدِ بردارِ کعبہ) سے حضورؐ کی گفتگو دو مواقع کی منقول ہے: ایک عہدِ مکی میں، جب حضور کے کنجی مانگنے پر اس نے دینے سے انکار کر دیا تھا اور درشتی سے جواب دیا تھا۔ دوسرے فتحِ مکہ کے موقع کی۔ مصنفہ نے دونوں گفتگوؤں کو خلط ملط کر کے ایک ساتھ فتحِ مکہ کے موقع پر بیان کیا ہے۔ (ص ۱۹۲) سفرِ طائف سے واپسی پر مکہ کے جس سردار نے آپؐ کو 'جوار' عطا کی تھی، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا نام نوفل تھا اور وہ قبیلۂ مطعم کا سردار تھا۔ (ص ۸۸) صحیح یہ ہے کہ ان کا نام مطعم بن عدی تھا اور وہ قریش کے قبیلے عبد مناف سے تھے۔ قبل بعثت جو حضرات 'دینِ حنیف' پر قائم تھے ان میں سے ایک کو زید بن عمر کا بھتیجا لکھا ہے۔ (ص ۴۴) حالاں کہ ان کا نام زید بن عمرو بن نفیل تھا۔ ام المومنین حضرت

میمونہؓ کو حضرت عباسؓ کی بہن قرار دیا ہے۔(ص ۱۸۲) حالاں کہ وہ ان کی سالی تھیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ کی اور بھی فروگزاشتیں ہیں، جن کا اس تبصرے میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ مصنفہ کے افکار کے جائزے پر بعض مقالات لکھے گئے ہیں اور کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، مثلاً بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کے سیرت سمینار ۲۰۱۱ء میں محترمہ سمیہ اطہر نے مصنفہ کی تصانیفِ سیرت کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا تھا(اس سمینار کے مقالات کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔) اور جناب محمد اسماعیل بدایونی کی کتاب 'استشراقی فریب' اسلامک ریسرچ سوسائٹی کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

فاضل مترجمین نے کتاب کا بہت رواں اور شستہ ترجمہ کیا ہے، جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے جا بجا مصنفہ کے بیانات پر استدراکات اور توضیحی نوٹس لکھے ہیں، لیکن انہیں کتاب کے متن ہی میں قوسین میں درج کر دیا ہے۔ بہتر تھا کہ ان کا اندراج الگ سے حواشی میں کیا جاتا۔ شخصیات اور جگہوں کے ناموں کے تلفظ میں مترجمین سے بڑی فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً (قوسین میں صحیح لفظ لکھ دیا گیا ہے) ابوالدغنہ (ابن الدغنہ) مارور (معرور) نخلع (نخلہ) قیلیح (قیلہ) عقبہ بن ربیعہ (عتبہ) محمد بن سعید (سعد) ابو جریر طبری (ابن جریر) جہیم (جحیم) سلاّم بن مشکان (مشکم) صفوان بن المعتل (المعطل) مریسی (مریسیع) سفیان بن امیہ (صفوان) حلیت (حلیس) قبیلۂ جمع (جمح)۔ یہودی قبیلہ 'بنونضیر' کو ہر جگہ 'نذیر' اور 'بنوقریظہ' کو بیش تر جگہوں پر 'قریضہ' لکھا گیا ہے۔ کتاب کا ترجمہ شروع کرنے سے پہلے اگر سیرت پر کسی اردو کتاب کو غور سے پڑھ لیا گیا ہوتا تو یہ غلطیاں نہ ہوتیں۔ عربی شاعر کہتا ہے ہٰل أناالامن غزیّة... کہ میں تو قبیلہ غزیہ کا ایک فرد ہوں۔ اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: ''میں تو غازیوں میں سے ایک ہوں۔'' (ص ۲۴)

اس کتاب کے ترجمے پر مترجمین اور ناشر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے ، اگلے ایڈیشن سے قبل مذکورہ فروگزاشتوں کو درست کرلیا جائے گا اور مصنفہ کی غلطیوں پر بھی توضیحی نوٹس کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار مرتبین: ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

مولانا محمد جرجیس کریمی

ناشر: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ، ۲۰۱۵ئ، صفحات: ۸۳۸، قیمت: ۶۰۰

اس مجموعۂ مقالات میں، جو اردو کے ۳۶ مقالات پر مشتمل ہے، سبھی اسلامی و غیر اسلامی تہذیبی وسیاسی افکار کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور تاریخ بھی، اسلام کے مثبت کردار کو دلائل سے مزین کیا گیا ہے اور معترضین کے اعتراضات کی تردید اور علمی تنقید بھی کی گئی ہے۔ متعدد موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم کیا گیا ہے، سیاسی نظام اور تہذیبی رویوں پر معاندین اسلام کے اعتراضات کا اچھا علمی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ ادارۂ تحقیق کا حق تھا کہ وہ 'تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کے کردار' پر اچھا لٹریچر فراہم کرے۔ یہ کام ایسے دور میں ہوا جب امت میں تشکیکی مزاج کی تشکیل کے لیے ایک طبقہ متحرک ہے، وہ اسلام کی قائدانہ صلاحیت سے اعتماد اٹھا دینے پر آمادہ، تاریخ کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش میں مشغول اور اسلامی تہذیب کو سماج کے لیے غیر معقول اور ایک مصیبت کے طور پر پیش کرنے پر مصر ہے، مختصر یہ کہ اسلامی نظام حیات پر چہار جانب سے بڑے تیکھے حملے کیے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال میں ادارے نے تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کے واضح اور بے مثال اثرات کو نمایاں کرکے گویا فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس مجموعہ کے منتخب مقالات کو انگریزی وہندی میں بھی شائع کیا جائے۔

اسلام ایک مکمل دین اور قیامت تک کے لیے آخری دستور حیات ہے، اسی لیے اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو انسانی زندگی کی تکمیل وتعمیر اور امن وسکون فراہم کرنے کا ذریعہ بن سکیں۔ اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ وہ جس چیز سے روکتا ہے اس کا بدل فراہم کرتا ہے یا اس کی اصلاح کرکے اسے اسلامی رنگ دے دیتا ہے۔ تہذیب اسلامی کی یہ خصوصیت سب سے اہم ہے کہ اس کی وسعتیں زمان ومکان کی ظاہری حدود

سے بالا ہوکر ملکوں اور قوموں کو اپنی آغوش عدل و مساوات میں سمیٹتی چلی گئیں، علم وادب، سیاست وحکومت، صنعت وحرفت، غرض ہر میدان میں اسلامی رنگ نظر آنے لگا۔ اسلام نے اپنے اثرات سب پر ڈالے، لیکن دوسروں کے تہذیبی رویوں کو من وعن قبول کرنے کے بجائے ان کا اسلامائیزیشن Islamization کر دیا۔ اس نے عدل ومساوات پر مبنی صالح تہذیبی رویوں اور سیاسی نظام سے انسانی دنیا کو آشنا کیا۔ اس لیے مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثہ اور سیاسی نظام پر فخر کریں۔ ضرورت ہے کہ اس کی ترویج وترقی کے ذرائع سے ازسرنو بحث کی جائے اور نئی نسل کا اس پر اعتماد بحال کیا جائے۔ یہ مقالات اس موضوع پر قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

اس مجموعہ سے یہ بات مترشح ہے کہ تہذیب وسیاست لازم ملزوم ہیں اور یہی صحیح بھی ہے۔ کیوں کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے، اگرچہ وہ مقصود نہیں ہے۔ قرآن نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر کی تعبیر اختیار کی ہے اور بلاغت کے رمز شناس جانتے ہیں کہ امر ونہی کی تعریف ہی یہ ہے کہ استعلاء کی بنا پر کسی کام کا حکم دیا جائے یا کسی کام سے روکا جائے۔ فی الحقیقت جب سیاسی بالادستی حاصل ہوتی ہے تو تہذیب وتمدن کو پنپنے کا موقع ملتا ہے، متعدد مفکرین بہ شمول احمد امین وغیرہ نے اس نکتہ پر خامہ فرسائی کی ہے کہ جو قوم غالب ہوتی ہے اسی کی تہذیب اور اسی کے نظام کا سکہ چلتا ہے۔ آج کے عالم اسلام کا مشاہدہ اس بیان کو صاد کرتا ہے کہ عالم اسلام میں کوئی ایک ملک ایسا نہیں جہاں اسلام کا مکمل مؤحدانہ نظام پورے طور پر نافذ العمل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا وہ رنگ، جو مطلوب و مقصود ہے، مفقود نظر آتا ہے، کیوں کہ عالمی نظام کا تسلط اور ہماری سیاسی مغلوبیت ہمارے نظام کے رائج ہونے سے مانع ہے۔

تہذیب وسیاست کا باہمی رشتہ بہت گہرا ہے۔ اس خیال کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ تہذیب وتمدن اور مدنیت جیسی تعبیرات کے ذریعہ کسی بھی قوم کی علمی ترقی اور اس کے وسائل کی زیادتی، جو حکومتی نظام سے مربوط ہوتے ہیں، ان کے نتیجہ میں ہونے والے

تعمیری نشاط اور اس کے نتائج کو بیان کیا جاتا ہے۔ ان تعبیرات کے استعمال سے حکومت کی وسعت، ثروت وخوش حالی کی فروانی اور اس سے متعلق اسباب تہذیب سے بحث کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم مقالہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا اس مجموعہ میں شامل ہے، جس سے تہذیب وسیاست کا رشتہ بھی معلوم ہوتا ہے اور تہذیب و اقدار کے علم بردار داعی کے لیے سیاسی شعور کی ضرورت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ مقالہ نگار کے اس خیال سے اتفاق ممکن نہیں، جو انہوں نے مولانا مودودیؒ کی کتاب 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں' پر مولانا علی میاںؒ کی تنقید کے حوالے سے ظاہر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''...راقم سطور کو اس کی علمیت کے باوصف یہ اختلاف خواہ مخواہ کی کج بحثی اور حرف ومعنی کا متکلمانہ انداز معلوم ہوتا ہے۔' میرے نزدیک سے یہ بات صحیح نہیں۔ اس بحث میں معتدل نقطۂ نظر ڈاکٹر اسرار احمد کا ہے جسے ناچیز غیر جانب دارانہ اور حقیقت پسندانہ سمجھتا ہے۔ انھوں نے 'میثاق' میں لکھا تھا کہ: ''مولانا مودودی نے اس بحث میں افراط سے کام لیا ہے، جب کہ مولانا علی میاں کی تنقید میں تفریط ہے''۔ یہ صحیح ہے کہ روحانیت کے فقدان اور حکومت کے قیام کو مقصد قرار دینے کی نفی میں مولانا کی اس تحریر میں کچھ تفریط نظر آتی ہے، لیکن ایسا کیوں ہوا؟ یہ بھی واضح ہے کہ افراط کی تردید میں ہوا۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلامی تہذیب و سیاست کی بنیاد، بلکہ تمام تر شعبہ ہائے زندگی کی اصل روح ذکر الٰہی، معرفت خالق اور فکر معاد ہے۔ اس مجموعہ میں شامل متعدد مقالات میں اس جانب اچھی توجہ کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب وسیاست کی بنیاد توحید پر ہے، اس کا دین وعقیدے سے گہرا تعلق ہے اور اس کے حاملین میں ذوق خدا طلبی سرفہرست رہتا ہے۔ جناب نصرت علی صاحب نے اپنے مقالہ میں اسلامی تہذیب کے عناصر کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتہ کی اچھی تشریح کی ہے۔ سیاست و تہذیب سے دین کے اس گہرے رشتے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسلامی تہذیب کا اہم عنصر عقیدۂ توحید ہے اور یہی وہ عنصر ہے جس نے مختلف عادات و رجحانات کی حامل اقوام کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ اسلام کے سیاسی نظام کا رشتہ دین

سے کس قدر ہے؟ اس کو واضح کرنے کے لیے مولانا محمد جرجیس کریمی نے اسلام کا سیاسی نظام اور محدثین کا نقطہ نظر' عنوان اختیار کیا ہے اور پورے توازن کے ساتھ سیاسی نظام کو شریعت کے جزء کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ مقالہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اس مجموعہ میں شامل متعدد مقالات میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب وسیاست مادیت کی ہوس سے پاک ہے، اس میں خالص مادی اور استحصالی ذہن کی قطعی گنجائش نہیں، اس کا روحانی پہلو اس کا طرہ امتیاز ہے، فکر معاد وہ محور ہے جس کے ارد گرد اسلامی تہذیب وسیاست گھومتی ہے، اس کی بنیاد دنیا طلبی کے بجائے خدا طلبی پر ہے۔ اس حقیقت کی طرف بھی خاصے اشارے اس مجموعہ کا حصہ ہیں کہ تہذیب اسلامی پر تیشہ چلانے کا کام غیروں کے ساتھ جو مسلم نام کے ان کے ان شاگردوں نے بھی خوب انجام دیا ہے جدید تعلیمی نظام کی ناقص تربیت کی پیداوار ہیں۔ یہ حضرات اسلام کے سیاسی نظام کو ناکام بتاتے ہیں اور اس کی تہذیب کی پرشکوہ عمارت کو بھی ڈھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اس کی قائدانہ صلاحیت، اس کی تاثیر اور وقت کے دھارے کے ساتھ چلنے، بلکہ اس کی قیادت کرنے کی صلاحیت میں شک ہے، ان کی طوطا چشمی اور قساوت قلبی سے آج اسلام پسند کراہ رہے ہیں، وہ تمام اسلامی نظام کو جدیدیت وعقلیت کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ ان حضرات کی پوری عمارت مستشرقین کے ملغوبوں پر کھڑی ہے۔ اسلام کے تعمیری کردار اور اس کے محاسن کو سمجھ پانا یا انہیں تسلیم کرنا ان بیمار ذہنوں کے لیے ممکن نہیں۔ اس ذہنیت کو سمجھانے کے لیے اس مجموعہ میں ڈاکٹر محمد رضی الاسلام صاحب کا مفید اور تجزیاتی مقالہ شامل ہے، جس میں انہوں نے علی عبدالرازق کی اس کتاب کا جائزہ پیش کیا ہے جس نے اس وقت کے معاشرے میں ہلچل اور اضطراب پیدا کردیا تھا۔

اس مجموعے میں بعض بڑے قیمتی مقالے شامل ہیں۔ بالخصوص وہ جن میں اسلامی نظام اور عہد حاضر کے تہذیبی یا سیاسی رویوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور

دونوں کے فرق کو دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مولانا کمال اختر قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی اور، جناب سید شکیل احمد انور کے مقالات اہمیت کے حامل ہیں۔ البتہ تہذیب وسیاست میں اسلام کے تعمیری کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے اگر دعوتی فریضہ اور اس کے رول کا ذکر نہ ہو تو تشنگی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ دعوت تہذیب کے فروغ کی ضامن بھی ہے اور سیاست کی داغ بیل ڈالنے سے پہلے مطلوب بھی۔ بہرحال ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری تہذیب و سیاست عقیدے سے مربوط ہے اور عقیدہ ہے اظہار دین کا۔ دنیا End of History اور Clash of Civilization کی خام خیالی میں مبتلا ہے تو رہا کرے، یہ عقیدہ ان شاء اللہ پھر رنگ لائے گا اور موحدانہ نظام قائم ہوگا۔ انتظار اس کا ہے کہ ہم عبادت حقیقی اور ایمان خالص کی شرط کب پوری کرتے ہیں اور دین پر کب عمل پیرا ہوتے ہیں؟ اس 'دین' کی بہترین تشریح مولانا سید جلال الدین عمری حفظہ اللہ نے اپنے کلیدی خطاب میں کی ہے۔ ان کا خطبہ اس اہم موضوع پر متوازن، مدلل اور بھرپور ہے۔ بلکہ اس کے آخری پیراگراف کو اس مجموعہ کا خلاصہ اور اس سیمینار کا پیغام قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اس وقت دنیا میں جو سیاسی بے چینی اور اضطراب ہے، طاقت ور قومیں کم زور قوموں کا جس طرح استحصال کر رہی ہیں، امنِ عالم کو جو خطرات لاحق ہیں، اخلاقی قدریں جس طرح پامال ہو رہی ہیں، ان کی وجہ سے یہ احساس بہرحال ابھر رہا ہے کہ ہمارے پولیٹیکل سسٹم میں کوئی خرابی ہے، اسے بدلنا چاہیے۔ کوئی ایسا نظام تلاش کرنا چاہیے جس میں ان مسائل کا حل ہو، لیکن کوئی متبادل حل ان کے پاس نہیں ہے۔ یہ بتایا نہیں جا رہا ہے کہ جب تک خدا کا خوف نہ ہو، احساسِ ذمہ داری نہ ہو، کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی۔ اسلام اس میدان میں ایک متبادل پیش کرتا ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر ہمیں اصرار کرنا چاہیے۔ کہیے کہ ہمارے پاس ایک آئیڈیل ہے، ہماری گفتگو سے یہ پہلو ابھرنا چاہیے کہ ہمارے پاس متبادل ہے۔ اس پر دنیا کو غور کرنا چاہیے۔''

ایک بات پر دو جگہ نظر پڑی اور ٹھہر گئی۔ ایک تو جناب اشہد رفیق کے مقالے

میں اور دوسرے افتتاحی کلمات میں۔ڈاکٹر اشہد صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ’’...حسنی مبارک کی اسرائیل نوازی ایران کو کسی طرح گوارا نہ تھی...‘‘ یہ بات انہوں نے ایران سے اخوانی حکومت کے سفارتی تعلقات کی استواری کے ضمن میں کہی ہے۔آگے مزید لکھا ہے: ’’اس کے نتیجہ میں ایران سے کافی قربت بڑھی‘‘۔ پوری تاریخ اور بالخصوص گزشتہ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے واقعات کا تسلسل اس پر شاہد ہے کہ عالم اسلام شیعہ، یہود اور نصاریٰ کے پنجۂ استبداد میں جکڑا ہوا ہے۔تثلیث کے اس مرکب کی سازشیں عیاں ہوجانے کے بعد بھی ایران سے کسی خیر کی امید، چہ جائے کہ تعلقات کی استواری کی بات کی جائے تو عبث معلوم ہوتی ہے۔’’ایران سے مرسی کی قربت بڑھی‘‘ یہ وہ پروپیگنڈہ ہے جو اس وقت کے سعودی ارکان حکومت نے کیا۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ شام کے سلسلہ میں مرسی کا موقف مجاہدانہ تھا، جب کہ سعودیہ اور ایران کا یکساں منافقانہ۔ گو مفادات جدا اور مقاصد الگ تھے،لیکن اخوان دشمنی میں دونوں برابر کے شریک تھے۔اکتوبر ۲۰۱۴ء کے تیسرے ہفتہ میں خامنہ ای کے اس بیان کے بعد کہ ’’اگر بشار الاسد کو تختِ اقتدار ہٹایا گیا تو اسرائیل کے وجود کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی‘‘ تعلقات کی استواری اور اسرائیل نوازی سے نفرت کی بات کہنا کس قدر بے محل معلوم ہوتا ہے۔اسی طرح ایران کی طرف سے جامع ازہر اور سیدہ زینب کے علاقہ کو ایرانی انتظام میں دیے جانے کے مطالبہ کا صاف اور دوٹوک انکار کرکے محمد مرسی کی قربت کیسے بڑھ سکتی ہے؟! ہاں یہ ضرور ہے کہ بہت سے لوگوں کی طرح محمد مرسی نے بھی اس ناسور کے اندمال کی وقتی کوشش کی،لیکن وہ ناکام رہے۔اسی طرح ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی کی یہ بات بہت عجیب سی لگی کہ ’’اسلامی تحریکات کی اپنے معاشروں میں رسائی اور نفوذ میں برابر اضافہ ہورہا ہے، وہ ہر محاذ پر پیش قدمی کررہے ہیں۔‘‘ اس ضمن میں انہوں نے جن ممالک کا نام لیا ہے ان میں سرفہرست ایران ہے۔مزید فرماتے ہیں کہ ’’ان کے بڑھتے قدم اور جاری پیش رفت سے اہل کفر واصحاب باطل حیران و پریشان ہیں‘‘۔ اس بیان کو یا تو موجودہ منظر نامہ اور ایران کے مذموم کردار اور تخریبی کارروائیوں

سے ناواقفیت پر محمول کیا جا سکتا ہے یا اب بھی ایران کے انقلاب کو شیعی انقلاب نہ تسلیم کرنے پر۔ ایران کی سنی دشمنی، بلکہ اغیار کی اسلام دشمنی میں اس کی قائدانہ شرکت اب کسی پر مخفی نہیں رہی۔ جتنے لوگوں نے اتحاد کی کوششیں کیں انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ معاملہ اتنا واضح ہو چکا ہے اور اس موضوع پر اس قدر لٹریچر وجود میں آچکا ہے کہ اب ایران کے انقلاب کو اسلامی قرار دینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسے شیعی انقلاب قرار دینے سے احتراز کسی طرح درست نہیں۔

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کیا کردار رہا؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ دین سے اس کا کیا تعلق ہے؟ عالم انسانیت پر اس کے کیا احسانات ہیں؟ عصر حاضر کے سیاسی مسائل میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ اسلام کی قائدانہ صلاحیت کو کس طرح فروغ دیا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعہ میں ان تمام سوالات کے جوابات موجود ہیں۔

امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس مجموعہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ (محمد طارق ایوبی)

زندگی کا خزانہ

مرتب: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

(اشاریہ زندگی رام پور، زندگی نو، نئی دہلی)

ملنے کا پتا: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۶ئ، صفحات: ۴۰۸، قیمت: ۲۰۰ روپے

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی اپنی علمی، دینی اور تحریکی سرگرمیوں اور فقہی مسائل پر اپنی تحریروں کے حوالے سے ہندو پاک میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ حال ہی میں اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہونے والی ایک نہایت بیش قیمت اور گراں قدر دستاویزی کتاب 'زندگی کا خزانہ' کو ان کی تصانیف کے ذخیرے میں اہم اضافہ تصور کیا جائے گا۔ یہ دراصل ماہ نامہ 'زندگی' کے مضامین اور تبصروں کا اشاریہ ہے، جو نومبر ۱۹۴۸ سے دسمبر ۲۰۱۵ تک کا احاطہ کرتا ہے۔ موجودہ عہد میں علمی رسائل وجرائد اور کتب کی اشاریہ سازی کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اور یہ اہل علم کے درمیان بے حد مقبول بھی ہے۔ اشاریہ کا بنیادی مقصد یہ ہے

کہ ریسرچ اسکالر اور محققین کو زیادہ وقت ضائع کیے بغیر اپنے مطلوبہ مواد تک رسائی ممکن ہو سکے۔

آغاز کتاب میں ڈاکٹر محمد رفعت مدیر زندگی نو کے تعارفی کلمات دیے گئے ہیں، جن سے اس اشاریے کی اہمیت ومعنویت واضح ہوجاتی ہے۔ جدول کی شکل میں تمام شماروں کی جلدیں اور ہجری وعیسوی ماہ وسال کی تفصیلات درج ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۸۰۶ ہے۔ عرض مرتب میں 'زندگی' کے ۶۷ سالہ صحافتی سفر اور استفادے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ قارئین کو سمجھنے میں جہاں مغالطہ ہوسکتا تھا، مرتب نے ان کی پہلے ہی وضاحت کردی ہے۔ اب تک کے مدیران: مولانا سید حامد علی، جناب سید عبدالقادر، مولانا سید احمد عروج قادری، مولانا وحید الدین خاں، مولانا سید جلال الدین عمری، ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی اور ڈاکٹر محمد رفعت کے اسمائے گرامی تحریر کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی حیات وخدمات کی تفصیل علیحدہ صفحات میں درج کیے جانے کی ضرورت تھی، تاکہ غیر تحریکی حلقے کے قارئین بھی سمجھ پاتے کہ ان کا شمار تحریک اسلامی کے ان عظیم مفکرین ودانش وروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے جماعت اسلامی کی فکری رہ نمائی کی ہے۔ اشاریہ میں اب تک شائع ہونے والے خاص نمبروں کی تفصیل بھی موجود ہے، جن میں مسلم پرسنل لا، طلاق، پانچواں کل ہند اجتماع، پیام مسجد، داعی اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، انٹرویو اور احکام ومسائل کے موضوعات شامل ہیں۔ ٹائٹل کی پشت پر ڈاکٹر محمد رفعت کے وضاحتی کلمات کا اعادہ ہے، جو کتاب کی ابتدا میں بھی موجود ہیں۔ یہاں مرتب کی سوانح اور علمی خدمات کا تذکرہ زیادہ موزوں تھا۔ اشاریہ سازی میں مواد کی الف بائی ترتیب دینے کا بھی دستور ہے، لیکن یہ انداز استفادہ کے نقطۂ نظر سے زیادہ مفید اور کارآمد نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اسے بہ اعتبار موضوع ترتیب دے کر استفادے کا دائرہ اور وسیع کردیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مضمون نگاروں اور مترجمین کی فہرست مرتب کر کے انھیں بھی اشاریہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ موصوف نے مواد کی چھان بین اور ترتیب وتدوین میں کتنی عرق ریزی اور دقت نظر سے کام لیا ہوگا، اس کا اندازہ اہل علم ہی لگاسکتے ہیں۔

قارئین پر واضح رہے کہ رسالہ 'زندگی' میں اشارات، مطالعۂ قرآن، ارشاداتِ رسول، مقالات، تراجم واقتباسات، اخبار وافکار، رسائل ومسائل، روداد اجتماعات اور تنقید و تبصرہ کی شکل میں مستقل کالم رہے ہیں، جن کے تحت مختلف موضوعات، مثلاً مذاہب وفرق، نظریات، اسلامیات، عقائد وایمانیات، عبادات، اسلامی علوم، رسائل و مسائل، تعلیمات واحکام، دعوت وتحریک، تصوف، تعلیم، سماجیات، معاشیات، سیاسیات، تاریخ، جغرافیہ، ممالک، سائنس، ادب، سیرتِ انبیاء، علماء اور سلف صالحین، مسلمان، تہذیب وثقافت، تنظیمیں، ادارے، کانفرنسیں اور سیمنار، ایوارڈ اور ماہ نامہ زندگی پر کل پانچ ہزار ترسٹھ (۵۰۶۳) مضامین کی اشاعت ہوچکی ہے، جب کہ اردو، عربی، انگریزی، فارسی اور ہندی زبانوں میں کل ایک ہزار دوسو تیرہ (۱۲۱۳) کتب ورسائل پر تنقید وتبصرے شائع ہوچکے ہیں۔ رسالہ 'زندگی' میں شائع شدہ کئی مضامین کتابی شکل میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی اور بعض دوسرے ناشرین کے یہاں شائع ہوچکے ہیں، لیکن اب بھی ان شماروں میں بہت سے مفید مضامین ہیں، جو کتابی صورت میں اشاعت کے منتظر ہیں۔ ترتیب وتدوین سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے موقع فراہم ہوگیا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ موضوع کا انتخاب کرکے جمع وتدوین کے کام کرسکیں۔

پیش نظر اشاریہ سے یقیناً ریسرچ وتحقیق سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے استفادے کی نئی راہیں کھلیں گی، تحریکی حلقے کے وابستگان کو یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ تحریک اسلامی کے دوراول کے قائدین کو کن مسائل اور چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا تھا؟ نیز ان آزمائشوں سے نکلنے میں وہ کس طرح کام یاب ہوئے؟ فہرست مضامین دیکھ کر یہ جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ کون سے اہم عناوین ہیں جن پر ابھی تک قلم کاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے؟ اس کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے میں مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ مرتب کی اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے اس عظیم کاوش کو شرفِ قبول سے نوازے۔ امید ہے، علمی حلقوں میں اس پیش کش کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ (ڈاکٹر عبدالرحمن فلاحی)

انچارج شعبۂ ادارت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۵۹)

☆ صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری کی نئی تصنیف 'تہذیب وسیاست کی اسلامی قدریں' کے نام سے بڑے اہتمام سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب اصلاً ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف مواقع پر تحریر کیے اور وہ مجلہ تحقیقات اسلامی میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے چند اہم عناوین یہ ہیں: تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار۔ اسلام امن وسلامتی کا پیغام۔ تحائف کی دینی وسماجی اہمیت۔ اسلام اور سیاست۔ اسلام کا شورائی نظام۔ اسلام اور انسانی حقوق۔ اسلام میں انسانی حقوق کی ضمانت۔ ان مقالات کی یکجا ترتیب سے تہذیب وسیاست کے میدان میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عمدہ پیرایے میں وضاحت ہوتی ہے اور اس کی تعمیر میں اسلام کا انقلابی کردار نمایاں ہوتا ہے۔ صفحات: ۹۶، قیمت۔/۶۵ روپے

☆ ۲۱ رفروری ۲۰۱۶ کو ادارہ میں 'تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار' کے عنوان پر منعقدہ سمینار ۲۰۱۴ء کے مجموعۂ مقالات کے اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر محمد طارق ایوبی (مہتمم مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ، شاخ ندوۃ العلماء لکھنؤ، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علیگڑھ) اور پروفیسر کنور محمد یوسف امین (طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اظہار خیال کیا۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ) نے تقریب کی صدارت فرمائی۔ رکن ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے پروگرام کی نظامت کی۔

☆ ۲۴ رجنوری ۲۰۱۶ء کو ادارہ میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی صدارت میں ایک توسیعی خطبہ کا انعقاد ہوا، جس میں مولانا مجیب الرحمن عتیق ندوی نے 'مسجد اقصیٰ۔ اسلامی تاریخ اور صیہونی سازشوں کے آئینے میں' کے عنوان سے اظہار خیال کیا۔ موصوف نے تفصیل سے مسجد اقصیٰ کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور ان سازشوں کو واشگاف کیا جو اس کے سلسلے میں امت مسلمہ کے خلاف کی جاتی رہی ہیں۔ آخر میں شرکاء نے مباحثہ میں حصہ لیا۔

☆ ۲۵ رفروری ۲۰۱۶ء کو مولانا محمد عتیق الرحمن سنبھلی (مدیر ماہ نامہ الفرقان لکھنؤ و صاحب زادہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ) جو عرصہ سے U.K میں قیام پذیر ہیں اور وہاں دینی و

دعوتی خدمات انجام دے رہے ہیں، ادارہ تشریف لائے۔ انہوں نے کارکنانِ ادارہ سے ملاقات کی اور انہیں مطالعہ وتحقیق کے سلسلے میں گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

☆ ۲۲ رمارچ ۲۰۱۶ء کو ادارہ کے اسکالرس کی انجمن 'رائٹرس فورم' کا ایک پروگرام ہوا جس میں ادارہ کے اسکالر جناب مجتبیٰ فاروق نے 'تہذیبوں کا تصادم۔ مکالمہ یا مفاہمت' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد شرکاء کے درمیان اس موضوع پر مباحثہ ہوا۔

مقالہ نگار حضرات سے گزارش

۱— کوشش کی جاتی ہے کہ محترم مقالہ نگاروں کی تحریریں تحقیقاتِ اسلامی میں جوں کی توں شائع ہوں، لیکن بسا اوقات موضوع پر ارتکاز کے مقصد سے یا مجلّہ کے صفحات کی تنگ دامانی کے سبب کچھ تحریریں مختصر کرنی پڑتی ہیں۔ زبان وبیان کی درستی اور سلاست پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ امید ہے، فاضل مقالہ نگار اسے بہ طیبِ خاطر گوارا کریں گے۔

۲ —تحقیقاتِ اسلامی میں صرف غیر مطبوعہ مقالات شائع کیے جاتے ہیں، اس لیے جو مقالہ اس میں اشاعت کے لیے بھیجیں اسے کسی دوسرے رسالے میں ہرگز نہ بھیجیں۔

۳—اگر تحقیقاتِ اسلامی میں کسی مقالہ کی کسی وجہ سے اشاعت ممکن نہ ہوگی تو اس کی اطلاع دے دی جائے گی۔ سہ ماہی رسالہ ہونے کی وجہ سے عموماً مقالہ نگاروں کو زحمتِ انتظار برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس پر ہم معذرت خواہ ہیں۔

۴—مقالہ خوش خط، ورق کے ایک جانب، صفحہ کے دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔ مقالہ کی اصل کاپی روانہ کریں اور فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں، کیوں کہ فوٹو اسٹیٹ کاپی میں بسا اوقات بعض الفاظ یا حروف مٹ جاتے ہیں۔

۵— بہتر ہوگا کہ مقالہ کو ان پیج فائل (Inpage file) میں ٹائپ کرکے tahqeeqat@gmail.com پر میل کریں۔

ISSN:2321-8339

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI
ALIGARH

Vol. 35 No.2

April - June 2016

Editor

Syed Jalaluddin Umari

Asstt. Editor

Mohammad Raziul Islam Nadvi

Nabi Nagar (Jamalpur), P.O. Box: 93
ALIGARH - 202 002 (INDIA)
www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

CONTENTS

1. **Principles and Etiquette of Dawah**
Syed Jalaluddin Umari 5

2. **The Evolution of Sufistic Trend of Qur'an Interpretation** 15
Hafiz M. Ahsan Raza

3. **The Institution of Accountability in Islamic Society: Its Importance, Limits and Conditions** 25
Maulana Muhammad Jarjees Karimi

4. **Amir Khusrau's Work Khazain al-Futooh: A Cultural and Social Study** 41
Dr. Muhammad Amin Aamir

5. **Donation of Human Organs and Parts Thereof: the Viewpoint of Islam** 49
Maulana Muhammad Qamaruzzaman Nadvi

6. **Islamic Concept of Economic Prosperity** 73
Dr. Sadia Gulzar

7. **Sheikh Ibn Arabi and His Qur'an Interpretation** 89
Dr. Towqueer Alam Falahi

8. **Book Reviews** 103

9. **Activities of Idara-e- Tahqee-o-Tasneef-e-Islami** 119

Abstract of the Articles

Principles and Etiquette of Dawah

Maulana Syed Jalaluddin Umari
President Idara-e-Tahqeeq and Ameer Jamaat-e-Islami Hind

The Central Department of Dawah hosted a three-day workshop of Zonal Secretaries of Dawah at the headquarters of Jamaat-e-Islami Hind from 4 to 6 September 2015. The lecture Maulana Umari delivered in its concluding session has been presented here for the benefit of the readers.

The Maulana, in his lecture, said the field of Dawah is very vast. Our address is not only to the entire country but the entire world as well. We have to work among the high-ups and also in the downtrodden strata of society. Hence our attitude should be such as can show that the Deen of Allah is for all human beings. He further said that human society has been divided in different classes and the so-called criteria of greatness have been devised. While in the light of Islam all humans are equal; their division between communities and tribes is just for the sake of identification. In Islam there is no room for force or coercion. Right and wrong have been expressly defined. Now everyone is free - whether he or she goes on following the wrong paths or embraces the Truth. The Maulana elucidated that Islam does not adopt the path of coercion but makes it abundantly clear that the Truth belongs to it alone. Other religions and ideologies are false and the result of deviation from the real Divine teachings.

The Evolution of Sufistic Trend of Qur' an Interpretation

Hafiz M. Ahsan Raza
Ph.D. Scholar, Dept. of Islamic Studies
Government College University, Faisalabad (Pakistan)
ahsanraza62@yahoo.com

Sufistic Interpretation of the Qur'an is one of the various trends of Qur'an interpretation. It means Qur'an interpretation by Sufis by making remarks which are contrary to the apparent meaning but with the possibility of establishing a connection and adjustment between the two. This is also called Tafseer-e-Ishari (Qur'an Interpretation by making remarks).

When we cast a glance at the history of Tafseer-e-Ishari, its various stages come to light. In the beginning, the Sufis preferred Tafseer-e-Ishari to Tafseer-e-Zahiri (apparent interpretation of the Qur'an). Later on, they neglected Tafseer-e-Zahiri, and depended solely on Sufistic Interpretation of the Qur'an. In the third stage, there appears to be a blending of Tafseer-e-Ishari and Tafseer-e-Zahiri. And in the last stage, there is dominance of Tafseer-e-Zahiri over Tafseer-e-Ishari.

This article throws light on the various stages of Tafseer-e-Ishari, and introduces its certain representative interpreters and their commentaries.

The Institution of Accountability in Islamic Society: Its Importance, Limits and Conditions

Maulana Muhammad Jarjees Karimi
Member, Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh
jarjeeskarimi@yahoo.com

Islam has laid much emphasis on equity and justice, and declared the accomplishment of Deeni and worldly affairs in the

light of Islamic teachings, the fulfilment of Huququllah (the rights of Allah) and Huqul'ibad (the rights of fellow citizens), and the establishment of equity and justice among the various social strata as the aims and objectives of an Islamic State. For this, it needs some assisting institutions. For example, Qada (judiciary), Ifta (jurisprudence), Sharta (police), Hisba (institution of accountability) and Diwan-e-Mazalim (whereby, in case of dispute, both the parties are brought to court even by force and justice done to them).

This article discusses the importance and need as well as the area of operation of the institution of accountability in the light of Allama Ibn Taymiyya's book *Al Hisba fil Islam*. It says that the objective of all government posts is Iqamat-e-Deen (establishment of the Deen). Islam lays much emphasis on Ijtimaiyat (collectivity). It is the duty of the muhtasib (supervisor) to pay attention to the Islamic and moral tarbiyah of people, and warn them against deviation, if any; and if they do not mend, punish them.

Amir Khusrau's Work Khazain al-Futooh: A Cultural and Social Study

Dr. Muhammad Amin Aamir
Kolkata

Amir Khusrau (d. 725H. / 1325 C.E) is considered the greatest poet of the Persian language and literature in India. Even the great poets of Iran have recognised his greatness. In his prose work *Khazain al-Futooh*, Khusrau portrays in detail the victories of Sultan Alauddin Khilji and the important events of his governance. This article, in the light of this book, elucidates how the Indian culture and society was, what strides the government achieved with respect to social reform and welfare issues, and what the condition of politics, economy, business and peace and harmony was in that period. Thus this book presents before the readers a picture of the culture and civilization of that period.

Donation of Human Organs and Parts Thereof: The Viewpoint of Islam

Maulana Muhammad Qamaruzzaman Nadvi
Gen. Secretary Maulana A'lauddin Educational Society, Jharkhand
maeducationalsociety@gmail.com

Modern advancements in the field of medicine and surgery have created many new medical situations. Where they have given medical benefits, they have also created many Shari'ah issues with regard to halal (lawful) and haram (unlawful). For example, transfusion of the blood of one person into the body of another person, replacement of one person's skin on the body of another person, transplantation of a person's eye, nose, kidney, etc. into the body of another person, establishment of milk and semen banks and free deal or give and take of these things, etc.

Islami Fiqh Academy (India) issued a questionnaire and organised a seminar on these issues. This article discusses these issues in the light of that questionnaire. At the very outset, it talks of the Islamic philosophy of the lawful and the unlawful. Then it discusses each such issue in detail and explains Islamic point of view in this regard.

Islamic Concept of Economic Prosperity

Dr. Sadia Gulzar
Lecturer, Dept. of Islamic Studies,
Lahore College for Women University, Lahore
sadiagulzar_lcwu@yahoo.com

Islamic concept of welfare ensures the spiritual and economic prosperity of people. This concept makes welfare a phenomenon common to all classes of society, so that clash between different classes may be avoided. Social welfare

policies are designed and implemented in such a way that inhabitants of all regions of a country may enjoy the fruit of economic development. In an Islamic state, it is the duty of the ruler to work for the welfare of masses. At state level, Zakat is an important source of public welfare. *Infaq fi Sabilil Allah* (to spend money in the way of Allah) is an automatic system of public welfare which helps fulfil the needs of the poor and help eradicating any possibilities of social conflict.

Under an Islamic state all activities that lead to economic decline rather than development such as interest, alcohol industry, income through gambling, bribe, dishonesty and stealth are banned, so that individuals by getting involved in such prohibited activities may not push the Islamic state towards spiritual and economic decline. In fact, the concept of economic prosperity can be materialised only by implementing the welfare principles of Shari'ah. Economic and social welfare can be attained through the practical implementation of the Islamic principles of public welfare such as compulsory obligation of Zakat, free basic necessities of life, improvement in tax collection and distribution, eradication of corruption, starting social welfare projects in backward areas and improvement of social values.

Sheikh Ibn Arabi and His Qur'an Interpretation

Dr. Towqueer Alam Falahi
Professor, Dept. of Theology (Sunni),
Aligarh Muslim University, Aligarh
towqueer@yahoo.com

Sheikh Muhiuddin Ibn Arabi holds extraordinary fame among the scholars and intellectuals of Andalusia. He was the founder of a Sufi philosophy and the doctrine of *wahdat al-wujud* (unity of being). *Fusus al-Hikam* and *Al-Futuhat al-Makkiyya* are two of his most important works which

represent his thought and his typical philosophy of wahdat al-wujud. One of his works is known as Tafseer al-Sheikh al-Akbar. In this book too, his philosophical thoughts are present with great thrust. This is not a complete Tafseer in the sense that it interprets each ayat.

This article presents in brief the life and academic accomplishments of Sheikh Ibn Arabi as well as a study of his Qur'an interpretation. And with the help of some examples, it explains his Sufistic and philosophical thoughts.

BOOK REVIEWS

1. *Mohammad-Asr Hazir ke Paighambar* (Mohammad: A Prophet for our time) Keran Armstrong; tr. Naim Ahmad Ghazi & S. Obaidur Rahman, 2016; Pages: 220; Price IR 195/-

   Reviewed by Dr.Mohammad Raziul Islam Nadvi

2. *Tahzeeb o Siyasat ki Tameer men Islam ka Kirdar* (The Role of Islam in the Development of Civilization & Politics) Copmiled by Dr. Safdar Sultan Islahi & Maulana M. Jarjees Karimi ; 2015; Pages: 838; Price IR 600/-

   Reviewed by Dr.Mohammad Tarique Ayyubi Nadvi

3. *Zindgi ka Khazana* (Subjective Index of Monthly Zindgi Rampur/Zindgie Nau New Delhi) Dr. M.Raziul Islam Nadvi; 2016; pages 408 , Price IRs.200/-

   Reviewed by Dr. Abdur Rahman Falahi

R.No. 38933/81
Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh
April ....2016 June 2016
Mob. +91-8126677681
Phone: 0571-2902034

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیات قرآن	۳۲۵/	۲۲	اوراق سیرت	۲۵۰/
۲	اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/	۲۳	خطبات پاکستان	۱۰۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۴	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/
۴	کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵/	۲۵	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۵/	۲۶	اسلام اور مشکلات حیات	۲۵/
۶	خدا اور رسول کا تصور - اسلامی تعلیمات میں	۱۳۰/	۲۷	خدا کی غلامی - انسان کی معراج	۱۳/
۷	معروف و منکر	۱۸۵/	۲۸	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۹/
۸	اسلام کی دعوت	۲۰۰/	۲۹	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/	۳۰	انفاق فی سبیل اللہ	۳۵/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۱	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۹/
۱۱	عورت - اسلامی معاشرے میں	۱۸۰/	۳۲	انسانوں کی خدمت - اسلام کی نظر میں	۱۹/
۱۲	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۱۰۰/	۳۳	جماعت اسلامی ہند - اس کی خدمات اور طریق کار	۳۵/
۱۳	عورت اور اسلام	۶۰/	۳۴	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۱۵/
۱۴	اسلام کا عائلی نظام	۹۰/	۳۵	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۱۵	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۳۵/	۳۶	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۶	قرآن کا نظام خاندان	۱۸/	۳۷	وقت حساب	۱۵/
۱۷	بچے اور اسلام	۱۰/	۳۸	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچائیے	۱۰/
۱۸	اسلام - ایک دین دعوت	۱۰/	۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۵/
۱۹	دعوت و تربیت - اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/	۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۲۰	ہندوستان میں اسلامی [illegible]	۵/	۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۲۱	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۸/	۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۳/

ملنے کے پتے:
۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲
۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

Design by: Faiz Ahmad